میکدہ

اکے

446

قمر یورش

# مصنف کی دیگر کتب

۱: میرا بچپن۔

۲: تمریورش کے افسانے۔

۳: پھر صبح ہو گی۔

# یارانِ میکدہ

(خاکے)

قمر یورش

عوامی پبلشرز

۶۳۔ مین روڈ۔ سمن آباد۔ لاہور

○ ناشر : قمر یورش۔
مالک عوامی پبلشرز۔ لاہور
○ پرنٹرز : نامی پریس پیسہ اخبار لاہور
○ سرورق : سلیم اختر
○ بار : اوّل ۱۹۸۴ء
○ قیمت : بارہ روپے

# انتساب

درویش صفت

میجر اسحاق محمد (مرحوم) کے نام

"ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے"

قمر یورش

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

# ترتیب

# تعارف

## مختار رانا ایم۔ اے

فن کار خالق کہلاتا ہے۔

لیکن سب سے بڑا خالق محنت کش طبقہ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ فطرت کا دست تعمیر ہو تخلیق نہ کرے تو زندگی کا چلتا ہوا کارواں رُک جائے۔ اور ارتقا کا دَور الٹا لوٹ جائے۔ یہی محنت کش طبقہ ہے جس نے انسانی ارتقا اور عظمت کے بلند و بالا مینار اپنے خون کے گارے اور ہڈیوں سے تعمیر کئے ہیں لیکن یہ ایک عظیم تاریخی المیہ ہے۔ کہ تاریخ کے اوراق میں کہیں بھی واضح طور پر اس محنت کش طبقہ کی عظمت کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ یہی محنت کش طبقہ ہے جس نے دھرتی کا سینہ چیر کر پھل اور پھول اُگائے ہیں۔ دریاؤں کے رُخ بدل کر بنجر زمین کو چمن زار بنایا۔ جنگلوں اور بیابانوں کو نہایت حسین و جمیل خطوں میں تبدیل کیا ہے۔ سمندروں کو جہازوں کے ذریعے پھلانگ کر نئی نئی بستیاں تلاش کیں اور پہاڑوں کے جگر چیر کر ان میں سے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے خفیہ خزانے

دریافت کئے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے سینکڑوں میل لمبی دیوارِ چین تعمیر کی ہے۔ فلک بوس قطب مینار بنایا ہے۔ جنت نظیر اور رشک فردوس شالامار تعمیر کیا ہے۔ سفید پتھروں کو تراش کر محبت کی زندہ و جاوید یادگار تاج محل کو نور کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ شاہی مسجد کے وسیع و عریض گنبد اور بلند مینار تعمیر کئے ہیں۔ اہرام مصر کی صدیوں پرانی عظیم الشان عمارتیں بنائی ہیں۔ حسن و عشق کے متوالے شہنشاہ جہانگیر کی خوبصورت آخری آرام گاہ بھی اسی مزدور طبقہ کی دستِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ لیکن بے شمار حسین اور لافانی شاہکار بنانے کے باوجود اس طبقہ کی بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ تاریخ کے اوراق ان عظیم عمارتوں میں سے کوئی بھی عمارت ان کے نام سے منسوب نہ کی جاسکی۔ یہ طبقہ صدیوں سے دوسروں کے نام کو روشن کرنے کے لئے اپنے خونِ جگر سے چراغ جلاتا رہا ہے۔ اس بات سے ثبوت ملتا ہے کہ سب سے بڑا فن کار یہ محنت کش طبقہ ہے۔ جو ادیب ان کی پیدا کی ہوئی چیزوں۔ ان کی محنت اور عظمت اور ان کے بے شمار مصائب پر قلم اٹھاتا ہے۔ وہ یقیناً عظیم فن کار ہے۔ وہ زندگی کے کارواں کو آگے بڑھاتا ہے۔ اور محنت کشوں کی زندگی کے حسن کو نکھار بخشتا ہے۔

تمر تیورش محنت کش بھی ہے اور محنت کشوں کے ادیب بھی۔ اس لئے اس کی تخلیق کا نکھار دوچند ہے۔ اس کا ادب زندگی بخش اور زندگی آموز ہے۔ ایک ادیب سائنس دان کی طرح بڑا طاقت ور ہوتا ہے۔ سائنس دان عناصرِ فطرت کا علم رکھتا ہے۔ اور انہیں قابو میں لاکر معجزے دکھاتا ہے ادیب ہمارے جذبات احساسات، ہماری امیدوں اور خدشات کو خوب سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے اس لئے وہ ہمارے تمام وجود پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جی چاہے تو ہمیں

کسی حسین وگلرنگ انقلاب کی جانب لے جائے۔ نہ جی چاہے۔ تو انیونی یا ظالم و مجرم بنا دے!

دو ہزار سال پہلے افلاطون نے اس بات کو بھانپ کر کہا تھا۔

"جب گیت کی سُر اور لَے بدل جاتی ہے۔ تو حکومت بدل جاتی ہے۔

نئی لَے اور سُر، نئے جذبات اور احساسات اُبھارتے ہیں، نئے خیالات کو جنم دیتے ہیں۔ اور خیالات عمل اور تحریکوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور تحریکیں تنظیموں کو وجود میں لاتی ہیں، یہ تنظیمیں انقلاب لے آتی ہیں۔ مگر بورژش انقلاب کی دشمن الاپتا ہے، محنت کشوں کے دل میں گھس جاتا ہے اور ہم سب میں ایسے گہرے عظیم و لطیف جذبات و تاثرات پیدا کر دیتا ہے کہ عوامی جمہوری انقلاب کی اَن مٹ تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ جو لوگ ادب برائے ادب کا چرچا کرتے ہیں وہ معصوم نہیں ذرا افلاطون کے مقولے پر غور کیجیے۔ انقلابی سُر اور لَے انقلاب کا باعث بنتی ہے۔ محض جنس۔ لذتِ جنس۔ بہار اور حُسن کے سطحی جذبات اور سطحی مذاق محض بورژوائی اندازِ حیات کا ذکر نہ صرف انقلاب کو روکتا ہے۔ بلکہ جہاں انقلاب آچکا ہو۔ وہاں پر مخالف انقلاب قوتوں کو غالب کر لیتا ہے۔

ادب برائے ادب کا نام لے کر خونچکاں حقائق سے بڑی بے عزتی اور بے حسی سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسے کسی گھر میں آگ لگی ہو، ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہو اور کوئی میٹھے بولوں میں لذتِ رُخسار کے گیتوں یا رومانی کہانیوں میں مگن ہو۔ یہ دنیا ایک گھر ہے۔ ایک کنبہ ہے۔ ویت نام میں آگ برس رہی ہے۔ ویت نامی بچے عورتیں اور جوان اس آگ میں جل رہے ہیں۔ اور دنیا کی سب سے بڑی ظالم طاقت کو شکست دے رہے ہیں جو فنکار اس عظیم حادثے اس خوفناک ظلم۔ اُس پر عظمت جدوجہد کو قلم بند نہیں کرتا۔ یا ان سے توجہ ہٹاتا ہے۔ وہ غافل ظالم اور مجرم۔ یا

انسان دشمن ہو سکتا ہے فن کار نہیں ہو سکتا۔

ادب زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ ادب برائے ادب کا نام لے کر زندگی کی چند چیزوں کو دوسری چیزوں پر ترجیح دے دی جاتی ہے۔ اور انہیں زیادہ قابلِ توجہ سمجھا جاتا ہے کیا یہ غیر جانبداری ہے؟ جانبدار تو محض دو قسم کا ادب ہوتا ہے زندگی سوز اور زندگی ساز۔ آپ ادب برائے ادب کا نام لے کر زندگی میں انسانوں کے ہر دردناک مسئلے سے چشم پوشی کریں۔ اور محض جنسی لذت، شراب و گل کا ہر وقت ذکر کریں۔ مگر ان مجرموں اور ظالموں کے خلاف صف آرا ہے۔ وہ زندگی کے مسائل محنت کشوں کی انقلابی جدوجہد پر ہماری توجہ مرکوز رکھتا ہے اور کسی بھی لمحے ذہنی عیاشی میں گم نہیں ہونے دیتا۔

کچھ ادیب اور فن کار ایسے بھی ہیں جو اپنے فن کے زعم میں سارے اخلاقی بندھن توڑ دیتے ہیں۔ شراب خوری۔ عورت بازی۔ جنسی بے راہ روی۔ خوشامد۔ دھوکا۔ مکاری۔ کاہلی فضول خرچی شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ وغیرہ وغیرہ کو اپنی طرزِ حیات بنا لینا اپنا حق تصور کرتے ہیں۔ ان کا فن ان کی زندگی کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ شعبدہ بازی کا یہی اثر ہوتا ہے کہ ان کے قلم میں وہ شدت اور گہرائی نہیں رہتی جو انقلابی تبدیلیاں پیدا کرے۔ ان کے ادب میں زبان کا چٹخارہ اور محض سطحی

گہرائی اور شدت نہیں رہتی جو انقلابی تبدیلیاں پیدا کرے۔

تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ انقلابی راہ سے ہٹ کر محض منافقت یا تضحیک کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر ایسا فن کار نہیں جس کو شہرت بگاڑ سکی ہو۔ جو فن کا نام لے کر اخلاق پسندی کو جائز قرار دینے لگا ہو۔ انقلابی محض انقلابی ادیب نہیں۔ وہ عملاً ایثار و فن پرستی اور قلندرانہ سادگی کو اختیار کئے ہوتے ہے۔ اور چھچھورے معاوضے یا اپنے مقصد کو نقصان پہنچانے والے انعام کو

حقارت سے دھتکار دیتا ہے۔

درحقیقت سب سے بڑی تخلیق سب سے بڑی رعنائی حُسن عمل ہے۔ اس عظیم غزل کا سوچئے جو شہید بھٹی کے گرم و تازہ خون سے رقم ہوئی۔ وہ افسانہ جو حسن ناصر لکھ گیا وہ فنی شاہکار جو بون ترائے نے سینے پر گولیاں کھا کے تحریر کیا وہ تخلیق جس نے الجزائر کی جمیلہ کی لاثانی قربانیوں سے جنم لیا انہی عہد ساز انسانوں کے متعلق کہا گیا تھا ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

عُرفی عرصہ ہوا نغمہ سرا ہوا ہے ۔

آغشتہ ایم بر سرِ خارے بخونِ دل!
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

قمر انہی لوگوں کی صف میں پیش پیش ہے جو اپنے خون میں نہا کر گل رنگ وحسین جہاں تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ قید و بند۔ پولیس کا تشدد۔ بھوک ننگ۔ ذلت و دھتکار ہی نہیں۔ اس دیوانے نے محنت کشوں کی خاطر اپنے دونوں بازوؤں پر گولیاں بھی کھائی ہیں۔ پھر کیوں نہ اس کی تحریر دل و جان گرما دے ۔

قمر نے ایک بار اس حقیقت کو پھر ثابت کر دیا کہ فن اور عظمت مکتب کی پابند نہیں۔ معلوم نہیں یہ ادیب تیسری جماعت میں فیل ہوا تھا یا پاس۔ اور گرامر بھی اسے آتی ہے یا نہیں لیکن تحریر میں وہ زندگی اور حُسن ہوتا ہے کہ کوئی محض ڈگریاں لے کر یہ بات پیدا ہی نہیں کر سکتا اور یہ حقیقت

ہے کہ سب سے بڑا مکتب خود زندگی ہے ۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود نہیں کہا جا سکتا ۔ کہ قمر نے ابدی عظمتوں کو چھو لیا ہے ۔ ہاں! وہ تیزی سے ان منازل کی طرف گامزن ہے اس کے فن میں پختگی و گہرائی ۔ وسعت و حسن ۔ روز افزوں بڑھ رہا ہے ۔ اگر وہ یوں دیوانہ وار چلتا رہا کسی شہرت یا مقبولیت کی منزل سمجھ کر رُک نہ گیا ۔ اگر وہ زندگی کے دُکھوں اور طوفانوں کو اسی شدت سے محسوس کرتا اور جرأت مندانہ علاج کی جانب مستقل مزاجی سے قارئین کو اُبھارتا رہا ۔ تو یقیناً ایک دن ابدی عظمت حاصل کرلے گا ۔

- پھر اس کے کردار محض لمبی تقاریر ہی نہیں کرتے رہیں گے ۔
- پھر وہ منظر کشی اور نئے آزمودہ الفاظ کے استعمال کو ہی تخلیقات کا جز نہیں بنائیں گے ۔
- پھر اس کے ہیرو بُرائی سے سمجھوتہ کر کے ندامت سے خودکشی کرنے کے باوجود ہیرو نہ رہیں گے ۔
- جہاں چیخ ہوگی ۔ وہاں للکار بھی ہوگی ۔
- جہاں گفتار ہوگی ، جذبات ہوں گے ۔ وہاں خیالات کی گہرائی ۔ الفاظ کا کم سے کم اور نہایت جچا تُلا استعمال بھی ہوگا ۔

ہاں! قمر اُن فن کاروں کا رہنما ہے جو ادب کی انقلابی تحریک کے سرخیل ہیں ۔ جو مرحوم ترقی پسندوں کی جگہ دلیری سے اُبھر کر سامنے آئے ہیں ، مثلاً حبیب جالب ۔ طالب جالندھری ۔ اسلم گورداسپوری وغیرہ وغیرہ ۔

لیکن دوستو! آج فن کا تقاضا ہی کچھ اور ہے آج تو ضرورت یہ ہے کہ ؎

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے   لڑا دے ممولے کو شہباز سے

وہ ادب جس کے ہیرو بادشاہ، شہزادے، جاگیردار محض جسمانی حسن، طاقت یا خصوصی ذہانت والے لوگ ہی ہو سکتے ہوں۔ جن کی ہیروئن کا خوبصورت ہونا شرطِ اوّل ہے۔ حالانکہ جسمانی خوبصورتی کسی انسان کے اپنے بس کا روگ کہاں ہے وہ قمر کا مطمع نظر نہیں، وہ اس معاملے میں سقراط سے مقابلہ کرتا ہے۔ ادب کے نام پر زر پرستی۔ جاہ پرستی اور جسم پرستی کا جرم اب جاری نہیں رہ سکتا۔

آج ضرورت ہے مظلوموں کو عمرؓ بن خطاب کی۔ خالدؓ بن ولید کی۔ مظلوموں کے لہو ترائے کی۔ ان لوگوں کی۔ جو ظلم کے خلاف ہر جگہ بدر و حنین بپا کر دیں۔ جو ہر جابر کے خلاف دیت نام بنا دیں۔ تاکہ زندگی سے ظلم اور اندھیرے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی سرور آور اور نکھرنے والی بہار کا دور دورہ ہو۔

مختار رانا۔ ایم اے
سابق پرنسپل پیپلز اکادمی۔ فیصل آباد

# منٹو صاحب

دسمبر ۱۹۵۴ء کی ابر آلود صبح تھی

آسمان پر سیاہ بادلوں کے ٹکڑے سورج سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے سورج کبھی شریر بچے کی طرح ہنستا مسکراتا بادلوں کی اوٹ میں سے نکل آتا اور پھر چھپ جاتا ہلکی ہلکی ہوا کے خنک جھونکے بدن کو سن کر رہے تھے میں نے ٹھیک نو بجے سعادت حسن منٹو کے مکان پر جا کر دستک دی اندر سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت سیدھے سادے سفید گھریلو لباس میں ملبوس نکلی۔ میں نے اس عورت سے کہا۔ میں سعادت حسن منٹو سے ملنا چاہتا ہوں اس نے میرے میلے کچیلے سیاہ تیل سے لتھڑے ہوئے کپڑے دیکھ کر نفی میں گردن ہلائی اور کہا، منٹو صاحب نہیں مل سکتے۔

میں نے نرمی سے پوچھا کیوں نہیں مل سکتے۔ مجھے تو ان سے ضرور ملنا ہے۔

عورت نے چڑ کر بڑی ترش روئی سے کہا "تم سے ایک مرتبہ کہہ دیا ہے کہ وہ نہیں مل سکتے خواہ انہوں نے تمہیں ملنے کے لئے خود ہی کیوں نہ بلایا ہو" پھر اس نے پیشانی پر بل ڈال کر نفرت سے پوچھا۔ کیا تم بڑے نواب صاحب کی کوٹھی سے تو نہیں آئے"

میں نے اس عورت کو سعادت حسن منٹو کی نوکرانی سمجھا اور جل کر جواب دیا۔ میں ساری دنیا کے نوابوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں تو ریلوے لوکو ورکشاپ کا مزدور ہوں اور مجھے منٹو صاحب سے ضروری ملنا ہے اس عورت نے تنگ آکر پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا "دیکھو مسٹر ڈاکٹر نے منٹو صاحب کو عام لوگوں سے ملنے جلنے پر پابندی لگا رکھی ہے اس لئے تم ان سے نہیں مل سکتے۔"

ہم دونوں بحث کر رہے تھے اتنے میں اچانک منٹو صاحب دروازے کی طرف آگئے۔ دبلا پتلا، چھریرا بدن سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں میانہ قد چمپئی رنگ بے قرار موٹی موٹی آنکھیں اور آنکھوں پر سنہرے فریم کی نازک سی عینک اور نگاہوں میں بیک وقت وحشت اور ذہانت کا امتزاج سر پر لمبے بال انہوں نے نہرو کٹ واسکٹ پہن رکھی تھی سگریٹ کا لمبا سا کش لگاتے ہوئے اس ادھیڑ عورت سے پوچھا "کیا بات ہے، صفیہ آج تمہارا موڈ خراب کیوں ہے" عورت نے چڑ کر جواب دیا، موڈ خراب کیوں نہ ہو۔ ہر کوئی اونٹ کی طرح منہ اٹھائے چلا آتا ہے اور آ کر کہتا ہے مجھے سعادت حسن منٹو سے ملنا ہے منٹو صاحب نے پوچھا مجھ سے کون ملنا چاہتا ہے"

عورت منٹو صاحب کی بیوی صفیہ بانو تھیں جنہیں میں غلطی سے نوکرانی سمجھ رہا تھا صفیہ بانو نے میری طرف حقارت سے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ حضرت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تم بڑے نواب صاحب کی کوٹھی سے آئے ہو تو یہ فرماتے ہیں کہ میں تمام دنیا

کے نوابوں پر لعنت بھیجتا ہوں میں تو لوکو ورکشاپ کا مزدور ہوں۔ مجھے منٹو صاحب سے ضرور ملنا ہے مجھے اُن سے ضروری کام ہے۔

سعادت حسن منٹو مسکرائے اور بڑی بے تکلفی سے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگے آؤ بھائی، اندر آجاؤ۔ میں بھی تمہاری طرح قلم کا مزدور ہوں تم ہتھوڑا چلاتے ہو میں قلم چلاتا ہوں صبح سے لے کر شام تک ان تھک محنت کرنے کے باوجود ہم دونوں بھوکے مرتے ہیں نہ تمہاری محنت کا پھل تمہیں ملتا ہے نہ میری محنت کا مجھے ٹھیک معاوضہ ملتا ہے۔

پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئے اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا میں شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صفیہ بانو پھر کمرے میں آئیں اور سعادت حسن منٹو پر دباؤ ڈال کر کہنے لگیں "آپ آج ان کے ساتھ ملاقات نہ کریں" وہ لجندیتیں شاید صفیہ بانو نے اپنے نامور شوہر سے میری ملاقات کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ صفیہ بانو کی تلخ آواز میں عاجزی کا رنگ تھا۔ سعادت حسن منٹو نے صفیہ بانو سے کہا۔ دیکھو صفیہ ناراض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں میں جب تک زندہ رہوں گا ان لوگوں سے ملتا رہوں گا۔ پھر وہ یہ مختصر سا جواب دے کر دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملتے ہوئے مسکرانے لگے ایک دلکش مسکراہٹ جیسے اس کے سارے وجود پر چھا گئی تھی۔ میں نے سعادت حسن منٹو کی طرف دیکھ کر افسردگی سے کہا رہنے دیجئے منٹو صاحب میں پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا ممکن ہے آج کی یہ ملاقات ان محترمہ کو ناگوار گزرتی ہو انہوں نے میرا ہاتھ محبت سے پکڑ کر کہا "نہیں بھائی، کوئی بات نہیں میں عام لوگوں سے مل کر خوش ہوتا ہوں مگر ڈاکٹر ہمیں عام لوگوں سے ملنے پر منع کرتے ہیں یہ میری بیوی صفیہ ہے یہ بڑی سیدھی سادی ہے بس یوں سمجھو اللہ میاں کی گائے

ہے یہ ڈاکٹر کے حکم کو اللہ کا حکم سمجھتی ہے اور میں ہوں کہ ان باتوں کا خیال ہی نہیں کرتا"

میں نے منٹو صاحب کی موٹی موٹی چمکیلی آنکھوں کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف بڑی محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ میرے سامنے اردو ادب کا جیالا فن کار بیٹھا تھا جس کے قلم کے آگے بڑے بڑے بت سرنگوں ہو جاتے تھے جو اپنے فولادی تیز نوکیلے قلم سے مکروفریب کے غلاف اتارتا تھا جس کے نام سے بڑے بڑے فرعون پناہ مانگتے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا واقعی سعادت حسن منٹو لاجواب آدمی ہے۔ کھرے سچے سونے کی طرح ذرا ملاوٹ نہیں، کھوٹ نہیں، فریب نہیں بناوٹ نہیں ریاکاری نہیں، مجھے خیال آیا قدرت نے دماغ تقسیم کرتے وقت سعادت حسن منٹو کے معاملے میں فیاضی سے کام لیا ہے۔

عوامی فن کار کی زندگی کھلی کتاب کی طرح ہوتی ہے جس کا مطالعہ ہر فرد کر سکتا ہے یہ کتاب کسی کو پسند آتی ہے کوئی ناپسند کرتا ہے کسی کو چند سطریں اچھی لگتی ہیں اور کوئی دیباچہ پڑھتے ہی بھاگ اٹھتا ہے۔

سعادت حسن منٹو سے پہلی ملاقات میں اس کی بیباکی سے مجھے کچھ ڈر لگا پھر جوں جوں زیادہ ملاقاتیں ہوئیں تو ہمدردی پیدا ہوتی گئی۔ اور پھر رفتہ رفتہ انس ہونے لگا۔ منٹو صاحب سے دوست اور دشمن سبھی خائف رہتے تھے سب ان کی افسانہ نگاری کی تعریف کرتے تھے جب وہ کسی شخص کی دکھی رگ پر ہاتھ رکھتے تو سب انہیں برا بھلا کہنے لگتے۔

سعادت حسن منٹو کے خلاف ان کے منہ پر کچھ کہہ لیں وہ خاموشی سے سن لیں گے لیکن اگر آپ نے ذرا سا بھی ان کے فن کے خلاف کچھ کہہ دیا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے انہیں یہ احساس

ہوتا تھا کہ وہ نہایت اعلیٰ دماغ کے مالک نہایت دانشمند انسان اور پیدائشی آرٹسٹ ہیں وہی فن کارانہ لاابالی وہی خودداری، وہی تنک مزاجی اور نازک دماغی، وہی اپنے فن پر ناز، روپے پیسے سے بے نیازی اور فن کے پیچھے جان دینے کا جذبہ جو سچے فن کار کی پہچان ہے وہ اپنے آپ کو افسانہ نگاری کا خدا سمجھتے تھے اور ہر وقت اپنی انا کا پرچم بلند رکھتے تھے۔

منٹو صاحب میرے سامنے بیٹھے ہوئے کسی سوچ میں کھوئے ہوئے تھے انہوں نے سگریٹ کا طویل کش لگایا ان کے چہرے پر سرخ لکیریں ابھری ہوئی تھیں اور سگریٹ کا کڑوا دھواں ان کے زرد چہرے پر بکھر گیا تھا میں انہیں بڑی عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔

منٹو صاحب ان دنوں سخت بیمار تھے۔ بیماری کی وجہ شاید شراب تھی ان کی موٹی موٹی چمکیلی آنکھیں ابلی ہوئی تھیں اور چہرہ پچکا ہوا تھا ان کی ایک ایک ہڈی نظر آرہی تھی وہ سوکھے بانس کی طرح تھے البتہ کھنڈر بتا رہے تھے کہ یہ بھی عمارت عظیم تھی تباہ حال ہونے کے باوجود ان کے دل میں خلوص تھا اور ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ سعادت حسن منٹو سخت طبیعت کے مغرور تھے مگر بڑے انسان دوست فن کار تھے۔ دراصل انہیں بناوٹ سے چڑ تھی خود ان کا ظاہر و باطن ایک تھا وہ کسی سے لگی لپٹی نہ رکھتے تھے جو کچھ کہنا ہوتا، منہ پر صاف صاف کہہ دیتے تھے اس لئے کچھ لوگ انہیں بدتمیز اور منہ پھٹ کہتے شکست قبول کرنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا یہ ٹھیک ہے کہ وہ بظاہر اکھڑ اور جھگڑالو نظر آتے تھے مگر ان کے پہلو میں بڑا حساس دل دھڑکتا تھا چونکہ دنیا نے انہیں بہت دکھ پہنچائے تھے اس لئے کبھی کبھی ان کے اندر نفرت کا جوار بھاٹا پیدا ہو جاتا تھا مگر منٹو صاحب میں انسانیت کی روشنی مرتے دم تک قائم رہی حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر انسان دوست

تھے بنی نوع انسان کی ہمدردی کا جذبہ ان کے دل میں بھرپور تھا وہ اسی جذبے کی روشنی میں اپنے فن کو طویل زندگی بخش رہے تھے وہ دکھی انسانیت کے لئے محبت کا پیغام تھے بقول شخصے فن کار مذہب رنگ و نسل کے تعصب سے آزاد ہوتا ہے فن کار جہاں بھی ہوگا اپنی اہمیت اور اپنا وجود ثابت کر دے گا۔

آمدم بر سر مطلب کہہ کر اپنا تعارف کرایا اور کہا جناب میں مزدور ہوں اور امرتسر کا مہاجر ہوں آج کل پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے ریلوے لوکو ورکشاپ میں کام کرتا ہوں میں نے پنجابی زبان میں ایک کہانی لبعنوان " وڈا انسان " لکھی ہے یعنی " بڑا انسان " آپ میری حوصلہ افزائی کے لئے دو چار سطریں تبرکاً لکھ دیں - انہوں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا " میں پنجابی زبان میں نہیں لکھتا"

میں نے عاجزی سے کہا " جناب، آپ نے حال ہی میں پنجابی زبان کے شاعر احمد راہی کی کتاب پر پنجابی میں اپنی رائے لکھی ہے -

وہ لاجواب ہو گئے میں نے گرم لوہے پہ مزید چوٹ لگاتے ہوئے کہا " جناب آپ کہانی سن لیں شاید آپ کو پسند آ جائے اور پھر مہربانی فرما کر دو چار حروف بطور تبرک لکھ دیں "

انہوں نے اپنی موٹی موٹی گول چمکیلی بلوری آنکھیں گھما کر مجھ سے پوچھا " کیا تمہارے پاس اس وقت کہانی موجود ہے، میں نے عرض کیا " جی ہاں - حاضر ہے "

میری کہانی " بڑا انسان " کوئی خاص چیز نہ تھی بس ایسے ہی ٹوٹی پھوٹی جذباتی سی کہانی تھی سعادت حسن منٹو نے کہا مجھے کہانی سناؤ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے کہانی کا مسودہ نکالا اور انہیں بڑے ادب سے ڈرتے ڈرتے کہانی سنانی شروع کی جب میں انہیں اپنی مختصر کہانی سنا چکا تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں انہوں نے عینک اتار کر سفید رومال سے آنسو پونچھے

بعد ازاں عینک کے شیشے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا "یار خواجہ کہانی تو تم نے بڑی زوردار لکھی ہے اور کمال جا ایک دستی نے کہانی کا تار و پود بنا ہے" میں نے انکساری سے کہا یہ میری پہلی کوشش ہے"۔

انہوں نے کہا ہاں پہلی ہی کاوش ہو گی پھر کہنے لگے "میں آج یہ تمہاری پنجابی کی کہانی سن کر رو دیا ہوں یا پھر پنجابی شاعرہ امرتا پریتم کی پنجابی نظم" آج اکھاں وارث شاہ نوں" پڑھ کر رو دیا تھا وہ بڑی شاہکار نظم ہے اور بڑی ہی دلدوز۔ اسے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نظم میں ساری انسانیت کا درد سمو دیا ہے۔

میری پنجابی کہانی "ڈڈا انسان" کا پلاٹ یہ تھا کہ کہانی کا ہیرو رانجھن ورکشاپ میں ٹریڈ یونین بنانے کے جرم میں نوکری سے نکال دیا جاتا ہے آخر میں وہ بھوک ہڑتال سے تنگ آ کر ایک تنور سے رات کو اپنی بیمار ماں اور معصوم چھوٹی سی بہن کے لیے روٹی چوری کرتا ہے پھر اسے اپنے جرم کا احساس ہوتا ہے اور اس کا ضمیر لعنت ملامت کرتا ہے اور کہتا ہے رانجھن آج تک لوگوں نے روپے پیسے کی چوری کی تھی مگر کسی نے روٹی کی چوری نہ کی تھی آج تم نے روٹی کی چوری کر کے انسانیت کی پیشانی پر بدنامی کا سیاہ داغ لگا دیا ہے رانجھن وہ روٹی ضمیر کے ملامت کرنے پر واپس تنور پر رکھنے جاتا ہے عین موقع پر تنور کا دروازہ ٹوٹا ہوا اور اندر سے رانجھن کو نکلتے ہو دیکھ کر پولیس کی گشت کرتی ہوئی پارٹی اُسے چور سمجھ کر گرفتار کر لیتی ہے ادھر گھر میں رانجھن کی ماں روٹی اور دوانہ ملنے پر تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتی ہے دوسری طرف کہانی کا ہیرو عدالت کے کٹہرے میں بھوک افلاس اور بیکاری کے خلاف احتجاج کر رہا ہوتا ہے کہ اسے اچانک دل کا دورہ پڑتا ہے اور حرکت قلب بند

ہوجانے سے اس فانی دنیا کی قید و بند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ تھا میری کہانی کا خاکہ۔ سعادت حسن منٹو نے۔ اس کہانی پر بڑا خوبصورت دیباچہ پنجابی زبان میں تحریر کیا تھا کہانی میں نے منٹو صاحب کے دیباچہ کے ساتھ شائع کی ان دنوں پاکستان نیا نیا بنا تھا اس کہانی کے چھپنے پر اخبارات اور رسائل میں میرے خلاف بہت کچھ لکھا گیا اور مجھ پر مقدمہ چلانے کے لئے اس کتاب کا انتساب سقراط کے نام تھا۔

چند دنوں کے بعد اس کہانی کی وجہ سے میرے وارنٹ جاری ہو گئے بعد ازاں خفیہ پولیس کے ایک تھانیدار کی سفارش پر یہ وارنٹ واپس ہوئے خفیہ پولیس کے اس تھانیدار نے لکھا تھا میں مسمی قمر یورش سے خود ملا ہوں وہ بہت مظلوم انسان ہے اور ننگے پاؤں پھرتا ہے اس کہانی کی بنا پر اسے گرفتار کرنا، نہ صرف اس کے ساتھ ظلم ہے بلکہ اس کی ادبی اہمیت بڑھانا بھی ہے۔

تھوڑی دیر بعد سعادت حسن منٹو کرسی سے اٹھے انہوں نے ایک میز کی دراز کھول کر خاکی رنگ کا لفافہ نکالا اس میں سے پنجابی شاعرہ امرتا پریتم کے لکھے ہوئے چار پانچ خط لا کر میرے سامنے رکھ دیئے میں نے وہ خط اٹھا کر دیکھے وہ خط پنجابی زبان میں ضرور لکھے ہوئے تھے لیکن گورمکھی حروف میں تھے میں گورمکھی نہیں جانتا تھا اس لئے میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا منٹو صاحب مجھے افسوس ہے یہ خط گورمکھی حروف میں ہیں اور میں گورمکھی نہیں جانتا۔ انہوں نے سر ہلا کر کہا کوئی بات نہیں وہ مجھ سے مزدور کی کٹھن زندگی کے متعلق سوال کرنے لگے اور میں انہیں جواب دیتا رہا کہ کس طرح مزدور سرمایہ دار کے پاؤں تلے دبے کچلے جا رہے ہیں۔ ان دنوں منٹو صاحب کی کہانی ٹھنڈا گوشت پر تازہ تازہ مقدمہ چلا تھا وہ سخت پریشان تھے اوّل تو انہیں اقتصادی پریشانیاں تنگ کرتی تھیں دوم بیماری سوم شراب

بھی گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہی تھی یہ بات سب جانتے تھے کہ ان کی زندگی کو روگ لگ چکا ہے وہ مہینوں پیٹ کی درد میں مبتلا رہتے۔ دیسی شراب جیسی زہریلی چیز خرید کر پیتے اس طرح اپنے سارے غم شراب میں ڈبو دیتے تھے یہ انہیں اچھی طرح علم تھا یہی شراب جس میں وہ اپنے سارے غموں کو ڈبوتے ہیں ایک نہ ایک دن ان کو بھی ساتھ لے ڈوبے گی شراب میں پانی کی ملاوٹ کے وہ یوں بھی قائل نہ تھے گویا شراب میں ملاوٹ کو وہ گناہ سمجھتے تھے اور شراب سستی تھی یہ کیسے منٹو کا جسم برداشت کر رہا تھا اس پر سب دوستوں اور دشمنوں کو حیرت تھی سب لوگ انہیں شراب پینے سے منع کرتے تھے اور سمجھاتے تھے اور بے تکلف دوست انہیں ڈراتے بھی تھے اور کہتے تھے اگر تم نے شراب نہ چھوڑی تو مر جاؤ گے اور وقت سے پہلے اللہ میاں کے گھر پہنچ جاؤ گے مگر ان پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا۔

منٹو صاحب دوستوں کی نصیحتیں ایک کان سے سنتے دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے کبھی کبھی وہ اپنی دلکش ہنسی کے ساتھ بڑی بے نیازی سے کہتے "پہلے ہی کون کا فرزندہ ہے مر تو وہ بھی جاتے ہیں جو شراب نہیں پیتے" وہ اکثر مذاق میں کہتے "میں بہت سخت جان ہوں جب میں نے موت کے فرشتے سے دو دو ہاتھ کئے تو وہ مجھ سے ڈر کر بھاگ جائے گا" جانے منٹو صاحب کے مضبوط قویٰ تھے یا ان کی قوت ارادی کا کمال تھا کہ وہ اب تک زندہ تھے اب یہ حال تھا کہ جب تک شراب ملتی رہتی وہ لکھتے رہتے جب شراب ختم ہو جاتی تو وہ یوں ٹھپ ہو جاتے جیسے چلتی موٹر میں سے پٹرول ختم ہو جائے۔ وہ پھول کی طرح مرجھا جاتے تھے لوگ انہیں نیم مردہ پاگل سمجھتے تھے مگر مخمور حالت میں بے حد مسرور، مطمئن اور زندہ دل نظر آتے جیسے اب انہیں کوئی دکھ نہ ہو کوئی غم نہ ہو وہ مے ناب میں روح کا غم اور کرب ڈبو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے یہی شراب تھا

شراب تھی جو انہیں تسکین دیتی تھی۔

منٹو صاحب روز بروز شراب کے دیوانے ہوتے گئے جوں جوں ذوق مے نوشی بڑھا، طلب بھی بڑھتی چلی گئی ہلکی سے ہلکی تیز سے تیز پھر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ وہ خالص سپرٹ پینے پر اتر آئے سپرٹ تند و تیز اور سستی تھی اور بغیر پرمٹ کے مل جاتی اور مدت تک مدہوش رکھتی تھی وہ یوں تو کئی سال سے اپنے جسم و جان کو آگ میں جھونک رہے تھے ان کے دوست اور بہی خواہ لاکھ سمجھاتے شراب چھوڑ دے مر جائے گا۔ کمبخت جلا کر راکھ کر دے گی یہ منحوس سپرٹ لیکن منٹو صاحب ناشروں سے پیسے ادھار لے کر پیتے تھے ناشر بھی ان کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ان کی لازوال کہانیاں کوڑیوں کے مول خرید کر ان کا استعمال کرتے تھے۔ وہ دوستوں سے ادھار مانگ کر پیتے دوست دشمن سب ان کے شراب پینے پر برا بھلا کہتے مگر وہ سب کی باتیں خاموشی سے سنتے رہتے تھے۔

ان کو سب سے زیادہ نقصان ناشروں نے پہنچایا ناشر انہیں پیسے دیتے ہوئے تنگ کرتے تھے۔ منٹو صاحب گھر کے اخراجات کے لئے ناشروں کی خوشامدیں کرتے تھے مگر یہ سنگدل لوگ ان کے سامنے نصیحت و فضیحت کے دفتر کھول کر بیٹھ جاتے جھوٹے بہانے کر کے انکار کر دیتے تھے چکر لگتے۔ ادھر منٹو صاحب اپنا قلم ہاتھ سے نہ چھوڑتے کہانیاں، ڈرامے لکھتے رہتے۔ انہوں نے اپنی ساری صناعی، سارا فن ساری صلاحیتیں کہانیوں میں سمو دی تھیں وہ کہانیوں کو نیا حسن بخشنے لگے۔ انہیں اپنے کام میں وہی سرور۔ وہی لطف وہی بے خودی دکھائی دیتی جو کسی بھی فن کار کو اپنے فن میں ڈوب کر نظر آتی ہے منٹو صاحب کو اپنے فن سے پیار بھی تھا اور اس پر ناز بھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو فن میں زندہ دفن کر لیا تھا وہ پیدائشی آرٹسٹ تھے قدرت کی طرف سے احساس حسن کا منبع ذوق لے کر پیدا

ہوئے تھے ان کی انگلیوں میں کمال تھا وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی روح پھونک دیتے تھے۔ وہ انسانی نفسیات کے ماہر تھے۔ عوام کے مزاج داں تھے، ان کی انگلیاں عوام کی نبض پر ہوتی تھیں۔ سعادت حسن منٹو اپنے اس کمال سے بخوبی واقف تھے۔ وہ نفاست پسند تھے تیز مزاج تھے خوش گفتار تھے مغرور جلد باز خود پرست لوگ انہیں سخت ناپسند کرتے تھے مگر سعادت حسن منٹو بھی ان کی کوئی پرواہ نہ کرتے وہ خوف ناک حد تک صاف گو تھے۔

سعادت حسن منٹو اپنے بال بچوں کے متعلق بہت سوچتے تھے کہ اگر اچانک انہوں نے آنکھیں بند کر لیں تو بال بچوں کا کیا بنے گا۔ انہیں اس بھری دنیا میں کوئی سہارا نظر نہ آتا تھا یہی وجہ تھی وہ ہنستے مسکراتے ہوئے ایک دم چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتے وہ میرے ساتھ کرشن چندر کی باتیں کرنے لگے اور کہنے لگے دیکھو یورش، یہ کرشن چندر اپنے نام کے آگے کس ٹھاٹ سے ایم اے ٹانکتا ہے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا" وہ اب اپنے نام کے آگے ایم اے نہیں لکھتا منٹو صاحب کرشن چندر تو آپ سے محبت کرتا ہے آپ خواہ مخواہ اس غریب پر برستے ہیں"

منٹو صاحب نے چڑ کر کہا "میں کب ان سے نفرت کرتا ہوں مسئلہ صرف یہ ہے" آگے میں مسئلہ خود ہی سمجھ گیا تھا۔ یہ منٹو کی انا کا مسئلہ تھا انہوں نے پوچھا "کیا غالب بی اے تھا؟ کیا شیکسپئر ایم اے تھا؟ کیا کالی داس پی ایچ ڈی تھا؟"

ہاں تو میں کہہ رہا تھا وہ گھوم پھر کر کرشن چندر کی طرف دوبارہ آئے اور کہنے لگے "کرشن چندر بہت غلط نویس ہے" میں ابھی خود طالب علم تھا۔ میں نے اس کے نئے انکشاف پر چونک کر پوچھا "وہ کیسے؟" منٹو صاحب بتانے لگے۔

"کرشن چندر ایک جگہ لکھتا ہے کہ سمندر کا پایاب تھا یعنی ٹخنوں تک، دھت تیرے کی۔"

چونکہ میرے دل میں کرشن چندر کے لئے بے پناہ محبت تھی۔ اس لئے میں کرشن چندر کی غلط نویسی کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں بات بدلنے کی کوشش کرتا تھا مگر منٹو صاحب بات کا رخ بدلنے نہ دیتے تھے۔ وہ کج بحثی پہ اتر آئے تھے میں نے پوچھا "منٹو صاحب، آپ پاگل خانے بھی تو گئے تھے۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ وہاں کس سلسلے میں وہاں گئے تھے؟ وہاں کیسا ماحول تھا؟ کیسے لوگ تھے؟ آپ نے وہاں کیا کیا دیکھا؟ اور کیا محسوس کیا؟ اور وہاں وقت کیسے گزرا؟"

انہوں نے بتایا کہ وہ شراب چھوڑنے کے سلسلے میں گئے تھے۔ میں نے دوبارہ پوچھا "پھر کوئی فائدہ ہوا؟" وہ بُرا سا منہ بنا کر کہنے لگے "خاک فائدہ ہوا ہے اب...... تم ہی بتاؤ خواجہ برسوں سے لگی ہوئی ایک دم کیسے چھٹتی ہے۔ فائدہ ہوتا تو میری یہ حالت ہوتی؟"

میں نے تجسس سے پوچھا "منٹو صاحب، پاگل خانے کا کوئی دلچسپ واقعہ سنایئے۔"

انہوں نے دماغ پہ زور دے کر کہا "ہاں، یاد آیا ایک روز پاگل خانے میں میرا جانگیہ گم ہو گیا تھا میں اپنے ایک پاگل دوست صدیق کے ساتھ اسے ڈھونڈتا رہا پاگل خانے کی ایک ایک بارک دیکھی ایک ایک پاگل سے پوچھا بھئی ہمارا جانگیہ جو سُرخ لٹھے کا ہے۔ گم ہو گیا ہے تم نے تو نہیں دیکھا۔ سب پاگل لاعلمی کا اظہار کرتے رہے میں خاموش ہو جاتا بعد میں صدیق پاگل نے مجھے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا منٹو صاحب آپ کو شاید پتہ نہیں یہ پاگل بڑے پکے چور ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں چرا لیتے ہیں اور چرا کر چھپا دیتے ہیں پھر بتلاتے نہیں کیا بتاؤں منٹو صاحب یہ تو دلوں سے راز اور آنکھوں کا سُرمہ تک اُڑا لیتے ہیں" خیر ہم شام تک جانگیہ ڈھونڈتے رہے وہ نہ ملنا تھا نہ ملا آخر جب میں

مایوس ہوگیا اور شام کو بارک میں بند ہونے کا وقت آیا تو صدیق نے اطمینان سے اپنی قمیض اٹھا کر پوچھا "منٹو صاحب، دیکھئے کہیں یہ آپ کا جانگیہ تو نہیں یہ صبح مجھے منہ ہاتھ دھوتے ہوئے نلکے کے قریب پڑا ملا تھا۔ میں نے دیکھا وہی میرا سُرخ لٹھے کا جانگیہ صدیق پہنے ہوئے تھا جبکہ میں اور وہ دونوں مل کر سارا دن پاگل خانے کی بارکوں میں ڈھونڈتے رہے تھے اور ایک ایک پاگل سے پوچھتے رہے تھے۔

میں نے دوبارہ فرمائش کی، "منٹو صاحب پاگل خانے کا کوئی اور واقعہ سنائیے۔"

انہوں نے پھر اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا "ہاں یاد آگیا ایک روز میں نے پاگل خانے میں ایک شخص کو دیکھا جو مجھے بڑا معصوم شکل کا دکھائی دیا وہ قطعی پاگل دکھائی نہ دیتا تھا میں نے اسے روک کر بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔ "سناؤ بھائی کیا حال چال ہے" اس شخص نے کہا "میاں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ تیسرا سال ہے اس جہنم میں آئے ہوئے" میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں آئے کیسے؟"

وہ شخص کہنے لگا "صاحب میں کیا بتاؤں آپ کو ۔۔ میں دس بارہ روپے روز کی مزدوری کرتا تھا شاہ عالمی دروازے میں رہتا تھا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا ایک شام کو مزدوری کر کے واپس گھر آیا تو تمام اہل محلہ میرے گرد جمع ہوگئے اور کہنے لگے تم پاگل ہو میں نے کہا تم پاگل تمہارا باپ پاگل تمہاری ماں پاگل۔ بس میرا اتنا کہنا تھا کہ جناب وہ مجھے پکڑ کر یہاں چھوڑ گئے بھائی وہ ظالم ایسے گئے کہ رسید تک نہ بھیجی۔ اب تیسرا سال ہے۔ یہاں اپنی تو بھائی صاحب قسمت ہی پھوٹ گئی اب میں سوچتا ہوں میرے بچوں کا کیا بنا ہوگا! خدا کے بعد انہیں صرف میرا سہارا تھا۔ میاں صاحب مجھے اپنے چھے چھنو منو بہت یاد آتے ہیں۔ میں رات کو اٹھ اٹھ کر اپنے بچوں کو یاد کر کے روتا ہوں۔"

سعادت حسن منٹو کہنے لگے کہ وہ شخص مجھے بالکل پاگل دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کی دکھ بھری کہانی سن کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اتنے میں اچانک وہ شخص کھانسا اور بلغم کا ٹیپا فوراً میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے بڑی نفرت اور حقارت سے کہا "سالے دو گھنٹے ہو گئے ہیں تیرے ساتھ بک بک کرتے ہوئے تجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ تو مجھے سگریٹ بیڑی کا پوچھ لے"۔

منٹو صاحب کہنے لگے "میرا تمام مشاہدہ اور انسان دوستی دھری کی دھری رہ گئی میں اپنا منہ صاف کرتا ہوا اُن سے کھسک آیا۔ وہ شخص مجھے بے ضرر معصوم شکل اور صحیح دماغ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی کہانی سن کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے جو اپنے معصوم چھوٹے چھوٹے بچوں پنچو منو کو یاد کر کے رات کو اُٹھ اُٹھ کر روتا تھا اُس وقت وہ غصے میں بھوت بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے سُرخ سُرخ چنگاریاں پھوٹتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اس کی حالت دیکھ کر میرا دماغ ماؤف ہو گیا"۔

منٹو صاحب نے مجھے پاگل خانے کے اور بھی کئی واقعات شروع سے آخر تک سنائے۔ پھر وہ سگریٹ سُلگا کر کچھ گنگنانے لگے۔ سعادت حسن منٹو میں ایک بڑی خوبی یہ تھی وہ بڑے بیباک تھے یہی بیباکی اُن کی نجی زندگی اور تحریروں میں نظر آتی ہے میں نے جانے کے لیے ان سے اجازت طلب کی تو کہنے لگے اگر تم دوبارہ مجھ سے ملنا چاہو تو میرے دروازے کی بجائے اس کھڑکی پر تین مرتبہ ہولے ہولے کھٹ کھٹ کرنا دستک ہوتے ہی مجھے پتہ لگ جائے گا۔ پھر میں چپکے سے باہر آ کر مل جاؤں گا۔ یہ صفیہ میری بڑی اچھی بیوی ہے مگر تمہیں علم نہیں عورت کا دل بالکل چھوٹی سی ہوتی حساس نازک، بالکل ننھا منا سا جیسے خشخاس کا دانہ ہو اچھا بھئی خدا حافظ مجھے نیند آ رہی ہے"۔

نیند میں اُن کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ "اب کل دوپہر کو ملاقات ہو گی" میں نے کہا"

"اچھا جی" اور میں وہاں سے گھر چلا آیا راستے میں دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے فنکار سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی۔

دوسرے روز میں دوپہر کی بجائے شام کو پہنچ گیا کھڑکی پر تین مرتبہ کھٹ کھٹ کر کے دستک دی تو منٹو صاحب بڑی بے چینی سے ٹہلتے ہوئے باہر نکلے آج ان کا حلیہ بہت سنورا ہوا تھا۔ انہوں نے صاف شفاف سفید کھدر کے سلے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے سگرٹ کی ڈبیا اور ماچس ان کے ہاتھ میں تھی اس وقت اُن کے ہونٹ تشنہ لب تھے اور فنکارانہ عکاسی کر رہے تھے۔

انہوں نے مجھے دیکھا اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا!

"تم دوپہر کو کیوں نہیں آئے؟"

میں نے عرض کیا "اس لئے حاضر خدمت نہ ہو سکا کہ دوپہر کو آپ آرام فرما رہے ہوں گے؟"

وہ کہنے لگے "میں تو دوپہر ہی سے تمہارا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔

میں نے حیرت سے پوچھا "خیریت تو تھی؟"

انہوں نے کہا "بس ذرا سا کام تھا۔"

پھر ٹہلتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگے "تم میرے لئے وائن کارنر سے شراب لا دو گے" میں نے نفی میں سر ہلا دیا انہوں نے پوچھا تم کیوں نہیں لا کر دے سکتے" میں نے نرمی سے جواب دیا کہ میں شراب سے نفرت کرتا ہوں۔

سعادت حسن منٹو نے کہا "اچھا تم میرے ساتھ تو چلو گے"؟ میں نے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی۔ انہوں نے اپنے کندھوں پر کوٹ ڈالا ہوا تھا، پھر ہم دونوں کھدر پوش وائن کارنر کی طرف

پیدل تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے فٹ پاتھ پہ چلنے لگے وائن کارنر انگریزی شراب کی دکان میٹرو ہوٹل کے پیچھے اور چڑیا گھر کے گیٹ کے بالکل سامنے تھی جب ہم میٹرو ہوٹل کے پاس پہنچے تو اس کے گیٹ کے بائیں طرف کوڑے کرکٹ کا باہر ڈھیر لگا تھا اتنے میں ایک بیرا آیا اس نے ایک بالٹی میں سے بچا کچا سامان خورد نوش کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکا ان میں باسی ڈبل روٹی کے ٹکڑے چھوٹی ہڈیاں اور نہ جانے کیا الم غلم تھا ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو تین کتے اور تین چار بھکاری بچے ایک ساتھ دوڑے اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگے اتنے میں ایک بوڑھا فقیر بھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آیا اور وہ بھی اس کچرے میں سے روٹی کے ٹکڑے ، ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھانے لگا یہ غریب نہ جانے کب کے خالی پیٹ تھے اور پیٹ کا دوزخ اس لئے بھر رہے تھے کہ بھوک سے بل کھاتی انتڑیوں کو تھوڑی دیر کے لئے تسکین دے سکیں ۔

میں اور سعادت حسن منٹو دیر تک کھڑے یہ دردناک منظر دیکھتے رہے ۔میں نے منٹو صاحب سے کہا "جلد چلئے یہاں سے میری طبیعت خراب ہو رہی ہے" منٹو صاحب کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے تم مشاعرے سے کتراتے ہو ۔ شاید تم نے یہ کراہت آمیز منظر زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے" میں نے جواب دیا " ہاں ۔ انہوں نے بتایا کہ میں یہ مناظر ہندوستان کے بڑے شہروں یعنی دلی ، بمبئی اور پونا میں کئی مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکا ہوں ۔

وہاں سے ہم میٹرو ہوٹل کے پیچھے کی طرف آئے ادھر ہوٹل کے ملازموں نائیوں ، خانساموں دھوبیوں اور بیروں کے ٹوٹے پھوٹے کوارٹر تھے اس کے ساتھ ہی انگریزی شراب کی دکان تھی جب ہم دکان کے اندر داخل ہوئے تو ایک گورا چٹا نوجوان ملا جس کی کلین شیو تھی اور سیاہ بال اس کی خوبصورتی

میں اضافہ کررہے تھے" اس انگریزی سوٹ میں ملبوس جوان نے آگے بڑھ کر منٹو صاحب کو بڑے ادب سے سلام کیا اور ساتھ ہی کہا "جناب! ابھی ابھی آپ کے نام پر ایک شخص دو بوتل وسکی کی لے کر گیا ہے، وہ کہتا تھا منٹو صاحب نے منگوائی ہیں اُس نے آپ کا نام لیا اور ہم نے فوراً آپ کے حکم کی تعمیل کی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ منٹو صاحب کا حکم آئے اور ہم تعمیل نہ کریں۔"

منٹو صاحب نے کہا" جی ہاں وہ شخص یہ ہے میری طرف انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ حضرت آپ سے شراب لے کر گئے تھے یہ کہتے ہیں دونوں بوتلیں راستے میں گر کر ٹوٹ گئی ہیں واللہ علم ٹوٹی بھی ہیں یا یونہی انہوں نے ڈکار مارے بغیر ہضم کر لی یا چھپا کر رکھ لی ہیں خیر یہ حضرت شراب کے معاملے میں ہر قسم کی بے ایمانی کو جائز سمجھتے ہیں۔"

اتنے میں ایک ملازم لفافے میں بوتل ڈال کر لایا اور اس نے وہ بوتل سعادت حسن منٹو کو بڑی عقیدت سے پیش کی وہ بوتل منٹو صاحب نے میرے حوالے کر دی جب ہم وائن کارنر سے باہر نکلے تو میں نے گلہ کرتے ہوئے کہا "منٹو صاحب یہ کیا ڈرامہ ہے آپ نے مجھے بے گناہ کو خواہ مخواہ مجرم بنا دیا میں کب یہاں سے شراب کی دو بوتلیں لے کر گیا تھا" یہ سن کر وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے" یار خواجہ قمر ورش اللہ سے میرے نام پر کوئی بھی دو بوتلیں لے کر نہیں گیا یہ شخص اس وقت مجھے لوٹنے میں سمجھ کر بیوقوف بنا رہا ہے اب تم ہی بتاؤ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بیوقوف بن جاؤں" راستے میں بیڈن روڈ پر حلوائی کی دکان سے بہتے قیمے والے سموسے لئے اور ساتھ چٹنی لی اور گپ شپ لڑاتے ہوئے گھر چلے آئے میز پر بوتل رکھ کر منٹو صاحب نے شیشے کی ایک الماری سے دو بلوری گلاس نکال کر مجھے شراب پیش کی اور شریر نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا" کیا خیال ہے خواجہ قمر ورش ہو جائے ایک ایک پیگ۔"

میں چونکہ مے نوش نہ تھا اس لئے ان کی اس دعوت ناؤنوش میں شرکت سے معذرت کر دی - اور ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے کہا جناب آپ مجھے معاف فرمائیں - انہوں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا "وہ کیوں" میں نے نرمی سے بتایا "شراب تو بہت دور کی بات ہے میں تو پان سگریٹ اور چائے سے بھی نفرت کرتا ہوں"

انہوں نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر اشارہ کرتے ہوئے کہا "بس تو بن چکے تم افسانہ نگار مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے - تم کیوں انکار کر رہے ہو تم بھی مرزا ادیب ہی بنو گے -

میں نے جواب دیا "جی ہاں میں مرزا ادیب کے نقش پا پر چلنا فخر محسوس کروں گا ویسے بھی مرزا ادیب میرا محبوب ادیب ہے باقی رہا شراب کے مفت ہونے کا سوال تو منٹو صاحب زہر مفت بھی ملے تو اسے کھا نہیں لینا چاہیے - اس زہر کو وہی خوشی سے پی سکتا ہے جس کا زندگی کا پانچ دس لاکھ روپے کا بیمہ ہو یا ملک الموت سے اس کا دوستانہ ہو میرے ہاں ایسی کوئی بات نہیں"

وہ میری اس بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے انہوں نے گلاس کو منہ لگایا میں نے انہیں نہایت غور سے دیکھا پھر انہوں نے بلوری گلاس خالی کر کے میز پر رکھنے کے بعد سگریٹ سلگایا اور آہستہ سے میری طرف مخاطب ہوئے اور پوچھنے لگے "قمر یورش شاید تمہیں پتہ نہیں شیطان شراب نہیں پیتا" میں نے جواب دیا "جی ہاں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اب شراب نہیں پیتا" منٹو نے حیرت سے پوچھا "یار خواجہ قمر یورش تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ شیطان شراب نہیں پیتا" میں نے ہنس کر کہا - جناب میں بھی اسی دنیا میں رہتا ہوں جہاں آپ رہتے ہیں کل میں بازار سے گذر رہا تھا تو

اچانک شیطان سے ملاقات ہو گئی میں نے اس سے پوچھا کہ وہ شراب کیوں نہیں پیتا۔ شیطان نے مجھے بتایا تھا کہ میں آج کل شراب اس لئے نہیں پی رہا کہ میرا شراب کا پرمٹ چوری ہو چکا ہے اور میں باقی شراب پیوں بھی تو کیسے میرے حصے کی ساری شراب تو سعادت حسن منٹو پی گیا ہے۔"

میری اس بات پر وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے "خواجہ قمر پرورش تو بات کا خوب تبنگڑ بنا لیتا ہے" شراب پینے سے ان کے زرد چہرے پر سرخ لکیریں پھیلنے لگیں اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ناچنے لگی پھر آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر مسرت کی کرنیں جگمگانے لگیں ایک دو پیگ پینے کے بعد بلبل ہزار داستان کی طرح چہکنے لگے خوش مزاجی عود کر آئی۔ لطیفے دلچسپ واقعات سنانے لگے ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی اور ہنسی میں پھلجھڑیاں تھیں جوں جوں وہ پیتے گئے ان کی باتیں کانوں میں رس گھولتی رہیں ان میں پہلے کی طرح کا چڑچڑا پن غائب ہو گیا وہ ہشاش بشاش اور خوش نظر آنے لگے پھر اچانک بہک گئے۔ اور پوچھنے لگے "خواجہ تمہارا نام قمر پرورش کیوں ہے پرورش قمر کیوں نہیں؟" وہ کافی دیر یونہی گردان کرتے رہے۔

میں وہاں سے اٹھ کر گھر آنا چاہتا تھا تو وہ مجھے گھر نہ آنے دیتے تھے پھر ان کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور کچھ دیر کے بعد نیند کی دنیا میں کھو گئے وہ صوفے پر ہی سو گئے تھے اور میں چپکے سے کھسک آیا تھا۔

اس کے بعد میں اکثر ان کے ہاں جاتا رہا میری ان سے ملاقاتیں دوستی کے سانچے میں ڈھل گئیں ایک مرتبہ کا ذکر ہے سخت گرمی پڑ رہی تھی، میں اور منٹو صاحب انار کلی سے گھر کی طرف آ رہے تھے، میں نے ایک جگہ بورڈ لگا دیکھا جس پر "آب حیات ہوٹل" لکھا ہوا تھا میں نے انہیں

چھیڑنے کے لئے کہا "منٹو صاحب، سامنے ہوٹل میں چلیئے وہاں چل کر دیکھتے ہیں کہ آب حیات کیا ہوتا ہے" ان دنوں یہ غیر ملکی مشروبات فانٹا شیزان، ثمر قند، پیپسی کوکا کولا وغیرہ نہیں ہوتے تھے ہم دونوں جاکر بڑے اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے بیرا آیا سعادت حسن منٹو نے آرڈر دیا کہ دو گلاس شربت آب حیات لاؤ۔ بیرے نے جواب دیا "جناب آب حیات تو کسی شربت کا نام نہیں یہ تو ہمارے ہوٹل کا نام ہے ہمارے پاس سوڈا لیمن ہے۔ شربت صندل شربت نیلوفر، شربت بنفشہ ہے اور شربت روح افزا بھی موجود ہے مگر میں نے شربت آب حیات کا نام آج تک نہیں سنا، منٹو صاحب نے چڑ کر کہا" تو آپ نے باہر کیوں بورڈ پر آب حیات ہوٹل لکھا ہوا ہے اور شربت کی بوتلیں کیوں سجا رکھی ہیں کیا یہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے آپ ایسا کریں اس بورڈ آب حیات مٹا کر" واہیات ہوٹل لکھوائیں"۔

پھر ہم دونوں باہر آکر اپنی اس معصوم سی شرارت پر خوب ہنسے دراصل سعادت حسن منٹو نے شراب کا دوسرا نام آب حیات رکھ لیا تھا یہی شراب خانہ انہیں وقت سے پہلے قبر میں لے گئی ۱۹۵۰ میں غالباً ۱۸ جنوری کی صبح کا ذکر ہے ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ان کی موت کی خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کل تک تو بھلا چنگا تھا مگر سب جانتے تھے اسے گھن لگ چکا تھا موت تو اسے کبھی کا راکھ بنا چکی تھی وہ پہلے ہی ایک زندہ لاش تھا یونہی دن بیتتے رہے مگر آج اچانک خبر پھیل گئی کہ منٹو صاحب فوت ہو گئے ہیں دوڑا دوڑا ان کے گھر گیا انہیں نہلا دھلا کر آخری منزل کی تیاری ہو رہی تھی چاروں طرف سوگوار آب گوں آنکھیں لئے کھڑے تھے اس بلا نوش کے آخری دیدار کے لئے جو شرابی ہوتے ہوئے بھی انسان دوست اور اعلیٰ

ظرف کا مالک تھا جس نے بارہ روپے ٹوبہ ٹیک سنگھ، بابو گوپی ناتھ تماشا مجانی جیسی لازوال کہانیاں لکھی تھیں مجھے خیال آیا سعادت حسن منٹو کیسے مر سکتا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا لوگوں کے دلوں میں سعادت حسن منٹو کی لاش سفید لٹھے کے کفن میں لپٹی رکھی تھی چاروں طرف بچے بوڑھے اور نوجوان عورتیں لڑکیاں کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔ بچاری صفیہ کو بیہوشی کے دورے پڑ رہے تھے ایک بوڑھا کہہ رہا تھا "میرے بیٹے، تجھے کس کی نظر کھا گئی تو نے ابھی دنیا کا کیا دیکھا ہی کیا تھا" وہ لوگ جو زندگی بھر صرف شراب کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے رہے وہ بھی اس کا کفن ہٹا کر منہ دیکھتے اور روتے ہوئے پلٹتے تھے کتنے لوگ رو رہے تھے وہ کتنا بڑا فن کار تھا جو شراب پی کر بھی بہکتا نہ تھا جو فن کا پرستار تھا میں نے اپنے دل میں کہا۔

اے عظیم فن کار اب تم جا کر ابدی نیند سو جاؤ۔ تم نے دنیا میں بہت دکھ سہے ہیں آج ہر شخص دوست اور دشمن فن کار سعادت حسن منٹو کو خراج عقیدت پیش کر رہا تھا مگر آج وہ فن کار ہر بات سے بے نیاز سکھ کی ابدی نیند سو رہا تھا نہ جانے کتنے عرصے تک وہ مصیبت اٹھاتا رہا فاقے کرتا رہا مگر۔ آج ہر بات سے بے نیاز تھا۔

سفید چادر میں منہ چھپائے سب سے روٹھ کر کہاں جا رہا ہے۔ جہاں کسی کی محبت ٹھکرائی نہیں جاتی جہاں کسی کی وفا کی توہین نہیں ہوتی، فن کی تذلیل نہیں ہوتی۔ ایسی دنیا سے دور جس نے اس کا قدر نہ کی وہ افق پار ستاروں کے آگے چلا گیا جہاں کوئی جا کر واپس نہیں آتا۔

موسم ابر آلود تھا سردی شباب پر تھی منٹو کا جنازہ ساڑھے تین بجے شام لکشمی مینشن سے اٹھا تو شاہراہ قائداعظم پہ آیا تیس چالیس قدم کا فاصلہ خاموشی سے طے کیا پھر کلمہ شہادت

پڑھ کر ہائی کورٹ کے قریب سے سڑک پر مڑ گیا۔

جنازے کے ساتھ جو لوگ تھے ان میں کالجوں کے طالب علم زیادہ تھے چند ناشر یا تھے چند قلم والے تھے نوعمر ادیب تھے باقی اعزا یوں اچھے خاصے لوگ جمع ہو گئے تھے لیکن کہیں بھی شاہراہ قائداعظم پر ٹریفک نہ رکی نہ شہر میں کوئی ہڑتال ہوئی نہ ریڈیو نے منٹو کے متعلق کوئی خاص پروگرام نشر کئے چند ایک ناشروں نے اپنی دوکانیں اور دفتر ضرور بند کئے تھے مکتبہ جدید والوں نے اپنے گاہکوں کی اطلاع کے لئے اپنی دکان پر ہاتھ سے لکھا ہوا ایک اشتہار لگایا تھا جس پر لکھا تھا۔

اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار جناب سعادت حسن منٹو انتقال فرما گئے ہیں اس لئے ان کے سوگ میں آج دوکان بند ہے۔

مزنگ میانی صاحب کی جنازہ گاہ میں جب نماز جنازہ پڑھنے لگے تو زیادہ تر طالب علم جنازہ گاہ سے باہر کھڑے تھے ان میں۔ میں بھی باہر کھڑا تھا۔ ایک دوست نے جنازہ گاہ سے باہر آکر پوچھا یہ نوجوان باہر کیوں کھڑے ہیں میں نے ان کے کان میں آہستہ سے کہا ان کو نماز جنازہ پڑھنا ہی نہیں آتی اس نے مجھ سے بھی کہا تم تو اندر چلو میں نے جواب دیا کہ مجھے بھی نماز پڑھنا نہیں آتی وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا جنازگاہ کے اندر چلا گیا نماز جنازہ پڑھنے کے بعد جب منٹو کی میت لحد میں اتارنے لگے تو میں نے دیکھا دعائے فاتحہ پڑھانے والے مولوی کا بہت پستہ قد کے تھے ان کا قد چار ساڑھے چار فٹ کا تھا وہ مجھے کسی الف لیلے داستان کے جادوگر بونے کی طرح دکھائی دے رہے تھے انہوں نے سر پہ طوطری سی بوکر ملی والی ٹوپی

پہن رکھی تھی میرے دل میں خیال آیا کہیں ایسا نہ ہو کہ سعادت حسن منٹو کفن پھاڑ کر اٹھ بیٹھے اور یہ کہہ کر جھگڑا نہ کھڑا کر دے یہ کیا فراڈ ہے تم لوگوں نے میری توہین کرنے کی سازش کر رکھی ہے اسی لئے میرے فاتحہ کے لئے اتنے چھوٹے قد کا آدمی لائے ہو میں اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوں لہذا میرے لئے عبدالستار خاں نیازی جیسا لمبا چوڑا مولوی فاتحہ کے لئے لاؤ گے تو میں قبر میں دفن ہوں گا ورنہ میں انکار کر دوں گا اور ایک ایک کا پیچھا کر کے اپنی توہین کا انتقام لوں گا پھر دیکھوں گا کون مائی کا لال مجھے قبر میں دفن کرتا ہے۔

مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ موت کے پنجہ کی گرفت کافی مضبوط تھی میرے سامنے میانی صاحب کا قبرستان تھا۔ اس عالم خموشاں کا نظارہ کتنا دردناک تھا میں بتا نہیں سکتا اس اجڑی ہوئی دنیا کے باشندے بڑی کسمپرسی کی حالت میں تھے "کچی قبروں پر سوکھی خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں" ٹوٹی پھوٹی قبروں پر کتے لوٹ رہے تھے "کتنا عبرت ناک سماں پیش کر رہے تھے" کبھی یہاں کے باسی شہر خوباں کے شہزادے ہونگے "بڑی شان و شوکت اور قارون کے خزانوں کے مالک ہونگے ؛ سر بفلک عالی شان بلڈنگوں میں رہتے ہوں گے خادم ان کے آگے پیچھے ادب سے جھک جھک کر سلام کرتے ہونگے ان کے اک اشارے پر حسن کی دنیا میں تہلکہ مچ جاتا ہوگا" اب بہتر خاک سو رہے ہیں" ان بے بس مکینوں میں امراء بھی ہونگے اور غرباء بھی مگر موت نے امیر غریب سب برابر کر دیئے ہیں" کسی کو امتیاز نہیں چھوٹے بڑے کا۔ یہاں تھیٹر کی دنیا کے شہنشاہ آغا حشر کاشمیری کی قبر بھی پاس ہی تھی" جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے" حسین نوجوان مرد عورتوں کے جھرمٹ لگ جاتے تھے جس کا اپنا ایک

شعر ہے۔

؎ صبحِ وصال کے کچھ ایسے ہوتے ہیں
بغیر حشر کے ممکن نہیں جگا دُنیا

اور قریب ہی ایک قبر میں سلمٰی کا عاشق اختر شیرانی سویا پڑا تھا یہ سب حسین و رنگین رومانی دنیا کے شیدائی اور روشنی کے پیامبر تھے یہ وہ ناز پروردہ تھے" جنہیں اندھیرے میں نیند نہ آتی تھی" جو ریشم و کمخواب پہنتے تھے۔ اور ہر وقت خوشبو سے معطر رہتے تھے" ہیرے جواہرات کے زیورات پہنتے تھے" جنہیں فرشِ مخمل بھی چبھتا ہوگا؟ جو تنہائی سے ڈرتے ہوں گے" ان میں وہ غریب بھی ہوں گے جن کے گھر میں روشنی بھی میسر نہ ہو گی جو کبھی خواب میں بھی قالینوں پر نہ چلیں ہوں گے نہ کبھی نرم و گداز بستر پہ سوئے ہوں گے؟ مگر آج سب بڑے آرام و سکون کے ساتھ بستر خاک پر لیٹے ہوئے ہیں قبرستان کی خاموشی میں کتنی حسرت ہے اللہ رے کتنا بڑا انقلاب ہے کل جو دوسروں سے ناز اٹھوانے والے تھے اور اُن کو بے بس رکھنے والے تھے آج خود کتنے بے بس اور مجبور ہیں" آج ان کے غم کی داستان سُننے والا یہاں کوئی نہیں کون سنتا ہے ان کی داستانِ الم کون لیتا ہے درسِ عبرت؟ کس کو اس مُرقعِ بے ثباتی کو دیکھ کر اپنے مٹنے کا خیال آتا ہے" ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداع سنہری کرنیں چراغ کی لو کی طرح اونچے اونچے درختوں کی پھنگوں سے بغل گیر ہو کر سنگ مرمر کی سفید تربتوں پہ دم توڑ رہی تھیں اور دُنیا کو فنا کا سبق دے رہی تھیں" املی۔ نیم۔ شیشم۔ کیکر کے اونچے اونچے پیڑوں پر گدھ خاموش بیٹھے اس اُداس منظر کو دیکھ رہے تھے" دُنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بربادیوں پر نوحہ خوانی شاید ان بدنصیب پرندوں

کے حصہ میں آئی ہے سعادت حسن منٹو کی لاش لحد میں اتاری جارہی تھی" میری آنکھیں سیلاب بن رہی تھیں" میں قبر کے سامنے کھڑا بہتے ہوئے ان لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا" جو ابدی ہو چکے ہیں" اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی" یوں محسوس ہو رہا تھا" جیسے سعادت حسن منٹو کو نہیں مجھے زندہ دفن کیا جا رہا ہے" میرے دل میں بار بار خیال آتا تھا۔

سعادت حسن منٹو کیوں مر گئے ؟

ابھی اس کے مرنے کے دن نہ تھے۔ کاش اس کے بدلے مجھے موت آجاتی اور میں مر جاتا۔ اس کو کسی نے کہا تھا" مرنے کو" وہ مرنے سے پہلے اپنے عزیز دوستوں سے مشورہ تو کر لیتے کہ میں مرنا چاہتا ہوں اگر یار دوست اسے مرنے کی اجازت دیتے" تو وہ مر جاتے" مگر سعادت حسن منٹو نے کسی سے مشورہ نہ لیا بلکہ چپ چاپ مر گئے۔ جیسے وہ چپ چاپ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان چلے آئے تھے" ویسے ہی چپ چاپ وہ پاکستان کو چھوڑ کر قبرستان چلے آئے !

آسمان پر سیاہ بادلوں کے چیتھڑے آوارہ پھر رہے تھے ہوا میں خنکی تھی۔ سعادت حسن منٹو کا جسد خاکی منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ ادبی دنیا کے بے تاج بادشاہ خوبصورت لازوال کہانیوں کے خالق جس نے اپنے قلم سے برصغیر پاک و ہند کے لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا تھا۔ اب میرے سامنے قبر میں آرام سے سو رہے تھے" قبر پر ہار پھول ڈالے گئے گلاب کا عرق چھڑکا گیا اگربتیاں بھی جلائی گئیں۔ اس وقت مجھے یہ شعر یاد آیا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

# جسٹس کیانی

سردی اس روز پورے شباب پر تھی دسمبر کا مہینہ تھا۔ آسمان پر خاکستری بادل منڈلا رہے تھے۔ فضا میں افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ سرمئی دھند میں لپٹا ہوا شہر لاہور بڑا خاموش اور پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ ہائی کورٹ کی پُرشکوہ عمارت اور ملحقہ باغ کے درخت نم آلود سے تھے مجھے چیف جسٹس ایم۔ آر کیانی کے سامنے پیش ہونا تھا۔ صبح کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا۔ میں ہائی کورٹ کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اتنے میں کسان رہنما شیخ رشید ایڈووکیٹ (جو آج کل مرکزی وزیر صحت ہیں) میرے پاس آئے انہوں نے اپنی قانونی خدمات مجھے پیش کی۔ میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ انہوں نے مجھے ناشتے کے لیے بھی پوچھا میں نے انہیں بتایا کہ میں جیل سے گڑ اور گندم کے دلیے سے

ناشتہ کرکے آیا ہوں سردی کی وجہ سے میں کھڑا ٹھٹھر رہا تھا میرے گلے میں ایک پھٹی ہوئی قمیض تھی اپنے قریب سے گذرتے ہوئے وکیلوں کے گرم سیاہ کوٹوں کو للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ میرے دل میں بار بار خیال آتا تھا۔ کہ کاش میرے جسم پر بھی کوئی کوٹ ہوتا۔ چاہے وہ پھٹا پرانا ہی ہوتا۔ کم از کم اس ظالم سردی کی تکلیف سے تو مجھے بچاتا۔ میری ڈاڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور میں اچھا خاصا افریقہ کا بن مانس دکھائی دے رہا تھا۔ کئی قسم کے خیالات میرے دل میں آرہے تھے کہ اتنے میں عدالتی چپڑاسی نے آواز دی "قمر یورشش"!

انسپکٹر پولیس نے جلدی سے میری ہتھکڑی کھولی اور مجھے ہائی کورٹ کے ایک چھوٹے سے خوبصورت کمرے میں لے گیا میں نے دیکھا چیف جسٹس ایم۔ آر کیانی کرسی پر تشریف فرما میری فائل کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کی لامبی اور مخروطی انگلیاں سردی سے گلابی ہو رہی تھیں۔ ان کے پیچھے آتشدان میں کوئلے جل رہے تھے آتشدان کے اوپر کارنس پر قائد اعظم کی تصویر آویزاں تھی چیف جسٹس ایم آر کیانی کبھی سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے اور کبھی بھاری بھر کم فائل کی طرف میں اس وقت ان کے سامنے کھڑا سردی سے کانپ رہا تھا یہی وجہ تھی کہ کبھی میں ادب سے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیتا اور کبھی سردی کی شدت سے اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا تا تھا چونکہ میں بغیر وکیل کے پیش ہوا تھا اس لئے تھوڑا سا متفکر بھی تھا کہ عدالت عالیہ کے سامنے اپنا موقف کس طرح پیش کر سکوں گا۔ ابھی ان خیالات میں میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ کہ ایک دھیمی سی آواز آئی "تشریف رکھیں"!

میں نے چیف جسٹس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں دراصل سردی میں کھڑا نہ صرف تھک گیا تھا۔ بلکہ اکڑ بھی گیا تھا۔ شاید انہیں میری خستہ حالت دیکھ کر رحم آگیا تھا۔ میں جلدی سے شکریہ ادا کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اب مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ یہاں میری فریاد سُنی جائے گی۔ اور میرے ساتھ انصاف بھی ہوگا۔ اس لئے میں نے اپنی صفائی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

چیف جسٹس کیانی نے مجھ سے پوچھا "تم اپنے متعلق کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا۔

"جناب والا۔ میں بالکل بے قصور ہوں مجھے ناحق گرفتار کیا گیا ہے!"

چیف جسٹس کیانی نے ایک بڑا سا خاکستری لفافہ اٹھایا اس پر لاکھ کی کئی سرخ مہریں لگی ہوئی تھیں۔ اس لفافے کو چھری سے چاک کر کے اس میں سے ایک اشتہار بعنوان "آزادی کہاں ہے" نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کس کا کارنامہ ہے؟"

"میں نے نرمی سے جواب دیا۔

"جناب یہ اشتہار میں نے لکھے تھے اور میں نے چسپاں کئے تھے حکومت نے میری گرفتاری پر انعام مقرر کیا تھا۔ اس انعام کے لالچ میں آکر میرے ایک دوست نے مجھے گرفتار کرا دیا!"

چیف جسٹس ایم آر کیانی مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہنے لگے۔

"اچھا ہے وہ پھر بھی آپ کا دوست ہے جس نے آپ کو گرفتار کرا دیا!" میں نے عرض کیا

"جناب حضرت یسوع مسیح کو بھی تو اُن کے خاص شاگرد یہودہ نے گرفتار کرایا تھا۔ اس

میں تعجب کی کیا بات ہے "؟

چیف جسٹس ایم آر کیانی نے مجھے کھلے طور پر جرم کا اعتراف کرنے پر اطمینان دلاتے ہوئے پوچھا۔

"تم پر یہاں کوئی دباؤ نہیں ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔ کسی ڈر کی وجہ سے تو نہیں کہہ رہے ہو میں نے عرض کیا۔

"جناب والا میرے نحیف و نزار جسم میں آزادی کی ایک تڑپ ہے جو مجھے حق و صداقت کی آواز بلند کرنے پر اکساتی ہے میں آپکے سامنے کسی ڈر اور کسی مصلحت کی وجہ سے نہیں بلکہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔ اپنے ضمیر کے ہمنوا ہو کر کہہ رہا ہوں۔ مجھے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں کہ میں زندہ رہوں یا مجھے قتل کرا یا جائے۔ میرا ایمان ہے کہ اس ملک میں عوامی جمہوریت آکے رہے گی۔ اور اس ملک کی باگ ڈور مزدوروں کسانوں دانشوروں کے ہاتھوں میں ہو گی انہیں آگے بڑھنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی"۔

چیف جسٹس کیانی کے دوسرے سوالات کے جواب میں میں نے بتایا کہ میں پاکستان میں محنت کش طبقہ کو حکمران دیکھنا چاہتا ہوں میں ایسی جمہوریت حکومت نہیں چاہتا جو کروڑوں غریبوں کے ووٹ لے کر مٹھی بھر سرمایہ داروں جاگیرداروں کے ایجنٹوں کو آگے لے آئے"۔ میں نے عرض کیا۔

"میں ایسی عوامی جمہوری حکومت چاہتا ہوں جس کی جڑیں عوام کے سینے میں ہوں"

میں نے بنیادی جمہوریت کے نظام کے متعلق کہا" یہ صرف دیہاتوں میں پنچایتی طرز

پر چلایا جا سکتا ہے مگر ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا۔ جب تک سیاسی پارٹیاں بحال نہیں ہو جاتیں تمام عوامی رہنما جیلوں سے باہر نہیں آ جاتے۔ انہیں آزاد طور پر کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اخبارات کی زبان پر سے سنسر کے تالے نہیں ہٹائے جاتے۔ ملک سے مارشل لاء کی لعنت ختم نہیں ہو جاتی" میں نے پوچھا۔

"جناب والا کیا یہ فسطائیت نہیں ہے کہ جو ملک میں سیاسی پارٹی بنائے اس کو سزائے موت دی جائے گی؟ اس سے بڑھ کر جنگل کا کالا قانون اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے" جسٹس ایم آر کیانی نے کہا۔

"جو تم نے جمہوریت کی بحالی کے لئے طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ وہ ٹھیک نہیں تھا" موجودہ سنگین حالات میں اس کے علاوہ مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا اس لئے میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا نہیں" پولیس کو اندیشہ ہے کہ تم جیل سے باہر جا کر پھر فوجی حکومت کے خلاف نفرت کا زہر پھیلاؤ گے۔

جواب میں میں نے اپنے تمام احساسات چیف جسٹس کیانی کے سامنے بلا کم و کاست رکھ دیئے۔ چیف جسٹس کیانی نے کہا۔

"مسٹر قمر یورش، تم رہائی چاہتے ہو مگر تم نے شاہی قلعہ میں پولیس کے روبرو جس قسم کی بات چیت کی ہے۔ اس کی روشنی میں تمہاری رہائی نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے"۔

"درست ہے" میں نے عرض کیا جناب والا مگر پھر بھی مجھے یقین ہے کہ میں نے کوئی

جرم نہیں کیا۔

جناب والا۔ میں نے ملک کے لئے آزادی کا مطالبہ ہے آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ یہ حق طلائی تختیوں یا مرمریں سلوں پر نہیں لکھا یہ ہر انسان کے دل پر نقش ہے اور اس کا احترام ہر حکومت پر لازم ہے۔ کوئی بھی خوددار شہری اپنے اس حق پر ڈاکے کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس حق کو نہ سنگینوں سے دبایا جاسکتا ہے۔ نہ گولیوں سے ختم کیا جاسکتا ہے نہ ٹینکوں سے کچلا جاسکتا ہے۔ آزادی کے اس جذبے کو جتنا دبایا جائے یہ اتنا ہی ابھر کر سامنے آتا ہے آزادی کے جذبے پر حملہ کرنا انسان کے سینے میں ابلتے ہوئے مقدس خیالات کی توہین کرنا ہے۔"

چیف جسٹس کیانی نے پُرشفقت لہجے میں کہا" قمر یورش! تم جانتے ہو عوام میں اتنا شعور نہیں۔ مجھے تمہارے جیسے نوجوانوں کو جیل کی خاک چھانتے ہوئے دیکھ کر دلی دکھ ہوتا ہے۔ ویسے میں تمہارے لئے بہتر کلاس دینے کی سفارش کردوں گا۔"

میں نے فوراً شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا" جناب! اگر آپ مہربانی کرکے انتظامیہ سے پوچھیں کہ میں نے جمہوریت کی بحالی کے علاوہ کوئی جرم کیا ہے۔ اور ان کے پاس میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو وہ مجھ پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلائیں۔ اور مجھ پر جرم ثابت کرکے پھر مجھے گولی سے اڑائیں یا پھانسی چڑھائیں۔ مجھے یہ منظور ہے۔ مگر جناب والا یہ مجھے ہرگز منظور نہیں کہ ایک شخص کو بغیر مقدمہ چلائے کسی وکیل اور دلیل کے بغیر سالہا سال کے لئے نظر بند کرکے زندہ درگور کردیا جائے۔"

میں چیف جسٹس - ایم - آر کیانی کی عدالت سے باہر نکلا تو باہر میرے والد اور نانی اماں ملنے آئی ہوئی تھیں - انہوں نے مجھے بتایا کہ محمد اسلم مذنب شاہی قلعہ سے آگیا ہے - خفیہ پولیس نے اس پر اتنا تشدد کیا ہے کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے اس کے دماغی توازن کھو جانے کے باوجود خفیہ پولیس اس کی کڑی نگرانی کرتی ہے میں نے ان سے تھوڑی دیر باتیں کیں پھر پولیس مجھے ڈسٹرکٹ جیل لاہور کی طرف لے کر روانہ ہو گئی وہاں مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا - دوسرے روز مجھے سنٹرل جیل ساہیوال بھیج دیا گیا -

## پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

مجھے ساہیوال جیل میں آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا - کہ ایک روز مجھے حکم ملا "تم پیشی لاہور جانے کے لئے تیار ہو جائے" میں نے لاہور جانے کے لئے بستر گول کیا - مجھے علم تھا - کہ لاہور بلا کر مجھے رہا کیا جائے گا - چونکہ حکومت کے پاس میرے خلاف کوئی اور ثبوت نہیں - اس لئے میں تمام نظر بندوں سے گلے ملا - ان سب کی آنکھیں جدائی کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھیں -

گلے مل کے میں رویا اسیران قفس کے جب کہ سُنا میں نے کہ وہ آزاد کریں گے - میں پولیس کی معیت میں لاہور پہنچا - اب کے مرتبہ مجھے ہتھکڑی نہ لگائی گئی - پہلے مجھے شاہی قلعہ لاہور لے جایا گیا - وہاں سے رایرٹ کلب میں شہزادہ حبیب احمد ڈی ایس پی خفیہ پولیس کے سامنے پیش کیا گیا - شہزادہ حبیب احمد نے مشروط طور پر رہائی کی پیش کش کی - میں نے انکار کر دیا - مجھے اچھی طرح پتہ چل گیا تھا - کہ ایوب شاہی حکومت کا محتاج یا یوسف ظالم گورنر نواب آف کالا باغ رہا نہیں کر رہا - بلکہ میری رہائی چیف جسٹس ایم آر کیانی کی سفارش کی وجہ سے ہو رہی ہے جو آپ

کافی عرصہ جیل میں گزارتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اُسے عنقریب رہا ہونا ہے۔ اس کی راتیں پُر اضطراب مسرت کی نذر ہو جاتی ہیں دل میں میٹھا میٹھا درد سا ہوتا ہے۔ رات کو ذرا آنکھ لگتی ہے تو چونک اٹھتا ہے۔ وہ اکثر خواب دیکھتا ہے۔ کہ اس کی رہائی کا پروانہ آگیا ہے جیل کا دربان ڈیوڑھی کا پھاٹک کھول رہا ہے اور اُسے باہر جانے کے لئے کہہ رہا ہے۔ میری حالت بھی ایسی ہی تھی نیند آتی تھی تو کوئی غیبی طاقت کہتی اٹھو اٹھو قمر لودھی دیکھو آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ کتنی ہی راتیں کروٹ بدل بدل کر گزر جاتیں۔ دماغ میں خیالات کے گھوڑے بگٹٹ دوڑتے۔ نیا گھر۔ نئی زندگی کے نئے منصوبے نیند کو پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ پھر نہ جانے کب نیند آکر مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ آج صبح کافی دیر سے اٹھ چکی تھی۔ آفتاب رفتہ رفتہ بلند ہو کر چمکیلی کرنوں کے سنہری تیر ہر طرف پھینک رہا تھا۔ جیل کی بھوری دیواریں اس کے اثر سے متاثر ہو کر نور کے حاشیے سے منور ہو چکی تھیں شعاعیں تاریک سے تاریک جگہ میں بھی کوئی نہ کوئی رخنہ یا شگاف اور کسی عاشق کی تیز نگاہ کی طرح گھر بنا لیتی تھیں۔ میں ابھی پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا۔ غنودگی کے عالم میں بستر پر ہی لیٹا ادھر اُدھر کروٹیں لے رہا تھا۔ چونکہ رات کو دیر سے سویا تھا۔ اس لئے نیند کے بوجھ سے آنکھیں خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن چونکہ دھوپ کافی آگئی تھی اور میں دھوپ کے نرغے میں تھا۔ اس لئے تنگ آکر اٹھ بیٹھا۔ اور جمائیوں اور انگڑائیوں سے نیند کا خمار دور کرنے لگا پھر میں ہمت کر کے اٹھا۔ اور صابن تولیہ لے کر جیل کے نلکے کے قریب بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ اتنے میں ایک نمبردار دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اور اس نے آکر مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ میری رہائی کا پروانہ آگیا ہے۔ میں جلدی سے اٹھا اپنا بوریا بستر باندھا اور گھر کے دُھلے

ہوئے کپڑے پہنے، میری رہائی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام جیل کے دوستوں میں پھیل گئی میرے دوست مجھے ملنے کے لئے آئے اور میں اُن کے ساتھ ساری جیل میں گھوما ساتھیوں کو الوداع کہی اور اپنی کوٹھڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں میرے رہائی کے کاغذات بنتے رہے گیارہ بجے میں نے روٹی کھائی پانچ بجے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور پھر مجھے رہا کر دیا گیا۔ قاعدے کے مطابق شام کی روٹی کے نہ تو مجھے پیسے دیئے گئے۔ اور نہ کرایہ دیا گیا جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ دل ہی دل میں غصہ سے پیچ و تاب کھاتا جیل کے آہنی پھاٹک سے باہر نکلا۔ میرے سامنے سہ پہر کی ہلکی ہلکی زرد دھوپ میں سڑک کا سیاہ فیتہ بے حس پڑا تھا میں اس سڑک پر چل پڑا۔ سورج افق کی سانولی فضا میں کپکپا رہا تھا۔ اس کا زرد زرد پگھلا سونا جیل کی اونچی دیواروں کو چھوڑ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ رات کا اندھیرا رینگ آیا۔ سڑک کالی رات کے گہرے اندھیرے میں کھو گئی۔ میں اپنے دل میں اپنے آپ کو سمجھاتا ہوا جا رہا تھا۔ بیٹا قمر یورش ایک چھوٹی جیل سے نکل کر بڑی جیل میں جا رہے ہو۔ ہوشیار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ چھوٹی جیل والوں نے تمہاری صحت غارت کر دی ہے اور بڑی جیل والے تمہاری زندگی چھین لیں۔

میں ہوائی چپل چٹخاتا ہوا رات کے دس بجے گھر آیا۔ تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اور نانی اماں کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"بجھا جو روزنِ زنداں تو دل نے یہ سمجھا
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے جو سلاسل تو ہم نے یہ جانا
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

# دادا منصور

ایک دن میں کراچی میں بندر روڈ پر جا رہا تھا کہ اچانک ایک بک سٹال پر ہفت روزہ رسالہ چٹان دکھائی دیا۔ وہ میں نے خرید لیا۔ راستے میں اس رسالے کو کھول کر دیکھا۔ تو کہاں گئے وہ لوگ۔ کی سُرخی پر نظر پڑی جو دادا منصور کی وفات پر جمائی گئی تھی۔ میں دادا منصور کی وفات کا پڑھ کر حیران رہ گیا اور دادا منصور کا معصوم چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا دادا منصور دبلے پتلے چھریرے بدن درمیانے قد گورے رنگ کے تھے مجھے دادا منصور کی وفات کے ساتھ کئی اور چہرے بھی یاد آئے جن سے بچھڑے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ نہ میں ان کے پاس گیا ہوں نہ وہ میرے پاس آتے ہیں ان کے خط بھی نہیں آتے وہ خود بھی نہیں ملتے۔ دل مانوس چہرے سنگی اور ساتھی جن کے دم سے محفلیں آباد تھیں اور مجلسیں زندہ تھیں وہ جو پھولوں کا نکھار

تھے آدھ کھلی کلیوں کی مسکراہٹ تھے وہ درخشندہ ستارے وقت کی گرد میں غائب ہو گئے جیسے کہکشاں کو بادلوں نے ڈھانپ لیا ہو اس کے باوجود محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پاس بیٹھے ہیں دل کے قریب اور نظر کے سامنے ہیں۔ مدتوں تک ان کے بچھڑنے کا یقین نہیں آتا وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور بچھڑنے کے بعد بھی ہر وقت ساتھ رہتے ہیں وہ لازوال ہیں اور ان کے زندہ کارناموں کی وجہ سے انہیں بقائے دوام حاصل ہے۔ دادا منصور بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ دادا منصور کی وفات کی خبر پڑھ کر مجھے یقین نہ آ رہا تھا، میری آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو گئیں جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ دادا منصور فوت ہو گئے ہیں دادا منصور جو مزدوروں کے ساتھی کسانوں کے غمگسار اور طالب علموں کے رفیق تھے جو ہر وقت مسکراتے رہتے تھے لہذا ان کی موت کی مزید تصدیق کے لئے میں ہفت روزہ فلمی اخبار نگار کے دفتر میں گیا وہاں پر ترقی پسند افسانہ نگار ابراہیم جلیس بیٹھے تھے میں نے ان کو دادا منصور کی وفات کی سُرخی دکھائی تو انہوں نے بتایا کہ دادا منصور کو تو فوت ہوئے دو ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے میں نے ان سے گلہ کرتے ہوئے کہا جلیس صاحب آپ نے تو مجھے۔

دادا منصور کی وفات کا بتایا ہی نہیں میں تو تقریباً آپ سے روزانہ ملتا تھا ابراہیم جلیس نے کہا میرا خیال تھا کہ تمہیں پتہ لگ گیا ہو گا۔ میں نے کہا دادا منصور کی وفات کی خبر تو کسی اخبار میں نہیں چھپی انہوں نے کہا صرف امروز اخبار میں تیسرے صفحہ پر ایک کالم میں دو تین سطریں چھپی تھی۔ چونکہ مارشل لاء کا سیاہ دور تھا اس لئے اتنی ہی اطلاع غنیمت تھی دادا منصور سے میری ملاقات ریلوے لوکو ورکشاپ کے سامنے مزدوروں کے ایک جلسہ عام میں ہوئی

تھی آپ مزدور رہنما مرزا محمد ابراہیم کے ساتھ جلسہ میں آئے تھے۔ راقم خود ان دنوں لوکو ورکشاپ
میں بطور مزدور کے کام کرتا تھا اس ملاقات کے بعد میری دادا منصور سے کافی بے تکلف دوستی
ہو گئی تھی۔ دادا منصور مجھے ہمیشہ شفقت سے ملتے تھے ہم جب بھی ملتے دو دو تین تین
گھنٹے تک مزدور مسائل پر بات چیت ہوتی تھی میری دادا منصور سے طویل ملاقاتیں کچھ
نستعلیق قسم کے جغادری لیڈر پسند نہیں کرتے تھے جنہوں نے پاکستان میں ہندوؤں کی
جائیدادوں کو اپنے باپ دادا کا مال سمجھ کر ناجائز قبضہ کر لیا تھا اور جو اعلیٰ ہوٹلوں میں
بیٹھتے تھے اور اعلیٰ کوٹھیوں میں رہتے اور اعلیٰ لباس پہن کر اور کاروں میں بیٹھ کر زبانی
زبانی سوشلزم کی خدمت کرتے تھے وہ لوگ میرے میلے کچیلے تیل اور سیاہی سے لتھڑے
ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر نفرت کرتے تھے دادا منصور شیخوپورہ کے ایک محنت کش گھرانے
میں پیدا ہوئے آپ کا پورا نام فیروز دین تھا۔ منصور ان کا تخلص تھا اور دادا انہیں عقیدت
سے کہتے تھے آپ نے شعور کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا
خونی حادثہ رونما ہوا جس سے آپ کے دل میں انگریز سامراج کے خلاف نفرت کی ایک ایسی
چنگاری پیدا ہوئی جو آگے چل کر شعلہ جوالہ بن گئی آپ زمانہ طالب علمی سے ہی برصغیر پاک
و ہند کی آزادی کی جدوجہد کے لئے سربکف ہو کر میدان میں نکل آئے اور خود کو وطن عزیز
کی آزادی کے لئے وقف کر دیا آپ قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اور دور
دراز دیہات میں گھوم پھر کر مزدوروں کسانوں کے دلوں میں غلامی کے خلاف نفرت
اور انگریز استبداد کا آہنی پنجہ توڑنے کے لئے انہیں ابھارنے لگے آپ اپنی جوشیلی

طبیعت کی وجہ سے مزدوروں کسانوں اور طالب علموں میں بہت مقبول ہوئے آپ کو کالج میں طلباء کی یونین کا جنرل سیکرٹری چنا گیا ۱۹۲۱ء میں جب تحریک ہجرت چلی تو آپ شعلہ بیاں مقرر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سے متاثر ہو کر اس میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے۔ آپ وہاں سے ترکی جانا چاہتے تھے اس وقت ترکی عوام غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں لڑ رہے تھے اس وجہ سے ترکی سرحدیں بند تھیں اور کسی بھی غیر ملکی کو ترکی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی مجبوراً آپ کو ترکی جانے کا ارادہ بدلنا پڑا اور آپ پیدل روس روانہ ہو گئے۔ دشوار گذار گھاٹیوں کو عبور کرتے ہوئے آپ کو ساتھیوں سمیت روسی ترکستان میں قزاقوں نے گرفتار کر لیا بعد ازاں انہیں جرگہ کے سامنے پیش کیا گیا جرگہ کے تمام ممبران نے متفقہ طور پر ان حریت پسندوں کو گولی سے اڑانے کا حکم دیا۔ بعد ازاں ایک بوڑھے قاضی کے دل میں رحم آیا اس نے ان سب کی سزائے موت منسوخ کر کے غلام بنا لیا۔ دادا مغفور اپنے ساتھیوں سمیت گھریلو کام کے علاوہ مویشیوں کی دیکھ بھال اور کھیتوں میں بھی سخت محنت کرتے تھے۔ صبح شام سخت جان توڑ محنت کرنے کے بعد انہیں برائے نام خوراک دی جاتی تھی جس سے وہ صرف زندہ رہ سکیں ذرا ذرا سی بات پر ان کی کھال کوڑوں سے ادھیڑی جاتی تھی اور رات کو ان شمع آزادی کے پروانوں کو جانوروں کی طرح باندھ کر رکھا جاتا تھا کہ کہیں یہ بھاگ نہ جائیں۔ آخر کار ان کی گرفتاری کی اطلاع کامریڈ لینن کو ملی تو ان کے حکم سے سرخ فوج نے قزاقوں پر حملہ کر کے

ان سب کو قید سے آزاد کرایا آزاد ہونے کے بعد یہ تمام لوگ، تاشقند پہنچے تو دادا منصور نے فوجی اکادمی میں اعلیٰ تربیت حاصل کی اور بعد ازاں وہ ایسٹرن یونیورسٹی ماسکو میں تعلیم حاصل کرتے رہے وہاں سے فارغ ہوکر ۱۹۲۳ میں ہندوستان واپس آئے۔ چترال کے قریب سرحد پار کرتے ہوئے گرفتار ہوگئے۔ چھ ماہ تک شاہی قلعہ لاہور کے تنگ و تاریک تہہ خانے کی سرد کوٹھڑی میں بند رہے ان کی والدہ اپنے لخت جگر کے غم میں گھل گھل کر فوت ہوگئیں اور یہ اپنی ماں کا مرتے وقت منہ بھی نہ دیکھ سکے ایک سال کے بعد رہا ہوئے تو رہائی کے بعد آپ دوسروں کو بھی آزادی کے رنگ میں رنگنے لگے۔ چونکہ سرکار برطانیہ آپ کو کسی صورت بھی کام نہ کرنے دیتی تھی اس لئے دادا منصور نے صحافتی زندگی اختیار کر لی وہ جی جی ہارنمن کے ساتھ انٹرنیشنل ہیرالڈ نکالتے رہے اس کے علاوہ مختلف روزناموں میں کام کرتے رہے۔ کانگرس۔ مزدور کسان۔ جنگِ آزادی کرتی/ نیا زمانہ، وغیرہ میں ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ بعد ازاں ہندوستان کیمونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئے ان کا تعلق مزدور کسان پارٹی نوجوان بھارت سبھا سامراج دشمن لیگ اور کسان سبھا سے بھی رہا۔ اور وہ ان میں کئی جماعتوں کے سیکرٹری بھی رہے۔ آپ ۱۹۴۱ میں دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ایک سال ڈیولی کیمپ میں بطور شاہی قیدی بھی رہے ۱۹۴۳ء میں عوامی جنگ کا نعرہ لگا تو کیمونسٹ پارٹی بحال کر دی گئی۔ تمام کیمونسٹ لیڈروں کے ساتھ دادا منصور بھی رہا کر دیئے گئے اور پارٹی پروگرام کے تحت تحریری کام کرتے رہے تقریر کرنا ان کے بس کا کام نہ تھا وہ قلم کے دھنی تھے۔ دادا منصور جامع الصفات تھے

ان کی وفات پر یوں محسوس ہوا کہ بیک وقت بہت سی شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں۔ ان کے رخصت ہونے سے قوم ایک ذی فہم اور ہوش مند مفکر سے محروم ہو گئی علم و دانش کا درس گاہ سے ایک شفیق اشتراکی استاد چل بسا۔ عوامی تحریک کا ایک عاقل رہنما اور دوستوں کا دردمند دوست رخصت ہو گیا جس کا بدل ملنا ممکن نہیں دادا منصور میرے دوست بھی تھے، رفیق کار بھی اور رہنما بھی راقم الحروف ان سے اکثر دوسرے تیسرے روز ملتا رہتا کئی کئی گھنٹے نشست رہتی، سیاست پر بحث ہوتی اور کبھی کبھی لطیفہ بازی بھی ہوتی تھی ایک مرتبہ دادا منصور کہنے لگے کہ میں نے تحریک ہجرت میں شرکت مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری کی شعلہ بار تقریر سے متاثر ہو کر کی تھی جب ماسکو سے واپس آکر عوامی تحریکوں میں حصہ لینے لگا تو اکثر سید عطا اللہ شاہ بخاری کے ساتھ ہمسفر رہتا۔ ایک روز میں نے مذاقاً سید عطا اللہ بخاری سے کہا شاہ صاحب روز محشر میرا ہاتھ اور آپ کا گریبان ہوگا شاہ صاحب نے تعجب سے پوچھا وہ کیوں فرزند دادا منصور نے جواب دیا اس لئے کہ آپ نے اپنی خطابت کے جادو سے ہزاروں مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کر دیا مگر آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ نے خود ہجرت نہیں کی سید عطا اللہ شاہ بخاری نے مسکرا کر کہا فرزند دین اگر میں تمہیں ہجرت نہ کراتا تو تم منصور کیسے بنتے اور دادا منصور نے جواب دیا واہ شاہ صاحب مجھے منصور بنانے کے لئے آج تو آپ نے ہجرت کروا دی، کل منصور بنانے کے لئے سولی پر لٹکوا دینا۔

دادا منصور مجھے کافی عرصہ کے بعد آزاد پاکستان پارٹی کے دفتر میکلوڈ روڈ پر ملے گپ شپ ہوئی۔ دادا منصور نے جیب سے پائپ نکالتے ہوئے پوچھا قمر یورش چائے پیو گے میں

نے نفی میں سر ہلا کر کہا نہیں دادا میں ابھی چائے پی کر آیا ہوں دادا منصور نے کہا یار ہماری خاطر پی لو ہم بھی تمہاری مہربانی سے پی لیں گے ، میں نے ۔ مذاق میں کہا اچھاجی دادا ہم تو دوستوں کی خاطر زہر تک پی لینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں یہ تو آپ کی چائے ہے ۔ جس میں آپ کے دل کی چاہت بھی شامل ہے دادا منصور میری یہ بات سن کر ہنسنے لگے اور پنجابی شاعر غلام محمد ہاشمی کو آواز دی اور کہا باہر ٹی سٹال والے کو ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دے ۔ غلام محمد ہاشمی نے جواب دیا اچھا دادا جی تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک خفیہ پولیس کا انسپکٹر چائے کی ٹرے خود اٹھائے ہوئے چلا آ رہا ہے وہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر خوبصورت اور اعلیٰ لباس میں متعاوہ انسپکٹر بیرے کی بجائے ہالی ووڈ کا ایکٹر دکھائی دے رہا تھا ۔ میں اس انسپکٹر کو اچھی طرح جانتا تھا اس لئے اس کو دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا جب وہ چائے ہمارے سامنے رکھ کر چلا گیا تو میں نے دادا منصور سے پوچھا دادا جی یہ جو شخص چائے لے کر آیا تھا آپ اسے جانتے ہیں یہ کون تھا ۔ دادا منصور نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا تم اسے جانتے ہو میں نے جواب دیا جی ہاں اس کو لوگ کہتے ہیں یہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر ہے ۔ دادا منصور نے چڑ کر کہا تمہارا دماغ خراب ہے یہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر نہیں ہے ۔ میں نے دادا منصور کو چڑاتے ہوئے کہا واہ دادا جی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری ہوتے ہوئے بھی یہ آپ کو معلوم نہیں آپ کے پاس کون آکر چلا گیا ہے ۔ دادا منصور کو تھوڑی سی بے چینی ہوئی اور غلام محمد ہاشمی کو آواز دیکر پوچھا ہاشمی صاحب قمر یورش کیا کہہ رہا ہے غلام محمد ہاشمی نے دریافت کیا دادا جی کیا کہہ رہا ہے دادا منصور نے بتایا کہ یہ جو ابھی چائے لے کر آیا تھا وہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر ہے ۔ مولوی

غلام محمد ہاشمی نے جواب دیا کہ قمر پوریش کو تو ساری دنیا ہی سی آئی ڈی کی نظر آتی ہے۔ مجھے غلام محمد ہاشمی کے اس جواب پر اور غصہ آیا میں نے دادا منصور کے سامنے یہ تجویز پیش کی اگر وہ شخص دوبارہ چائے کے برتن اٹھانے کے لئے آئے تو آپ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھیں کہ تمہارا عہدہ کیا ہے پھر وہ آپ کو بتائے گا کہ وہ کیا ہے اتنے میں اس انسپکٹر کی جو شامت آئی وہ دوبارہ چائے کے برتن لینے آگیا اور وہ ابھی برتن اٹھانے ہی لگا تھا دادا منصور نے اس انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں وہ انسپکٹر ایک دم گھبرا کر پوچھنے لگا دادا جی آپ مجھے اتنی بری طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ دادا منصور نے گرج کر پوچھا تمہارا عہدہ کیا ہے اس خفیہ انسپکٹر نے دیکھا کہ اب بھانڈہ پھوٹ گیا ہے وہ دادا منصور کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا میں خفیہ پولیس میں انسپکٹر تھا اب میں نوکری چھوڑ چکا ہوں دادا منصور نے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو تم اب بھی خفیہ انسپکٹر ہو اور اس وقت بھی ڈیوٹی پہ ہو۔ دادا منصور نے کہا اچھا تم یہ بتاؤ تم نے دفتر کے اندر آنے کی جرأت کیسے کی اگر یہاں کوئی تمہیں یہاں سے مار ڈالے یا ہاتھ پاؤں توڑ دے تو کون ذمہ دار ہوگا۔ تم نے زیادہ چالاک بننے کی کیوں کوشش کی ہے اس خفیہ انسپکٹر نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے کہا دادا جی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے مجھے معاف کر دیں میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ وہ خفیہ انسپکٹر برتن اٹھا کر دفتر سے باہر چلا گیا اتنے میں غلام محمد ہاشمی ہمارے پاس آیا تو دادا منصور نے کہا یار ہاشمی وہ تو واقعی خفیہ انسپکٹر نکلا مولوی غلام محمد ہاشمی نے اپنے آپ کو ایک غلیظ سی گالی دیتے ہوئے کہا تو ہم کیا کریں آس پاس میں جس سے بات کرو یا تو وہ خود سی آئی ڈی کا ملازم ہوتا ہے یا ان کا تنخواہ دار مخبر۔

دادا منصور کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی
اور دادا منصور ان دنوں نسبت روڈ پر صوفی ترک کے ہوٹل کے اوپر ایک چھوٹے سے کمرے
میں رہتے تھے میں انہیں اکثر دوسرے تیسرے روز جا کر دق کیا کرتا تھا۔ لہذا ایک روز حسب
عادت ان کے کمرے کا دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا اندر سے آواز آئی کون ہے میں نے حسب
عادت بڑے رعب سے جواب دیا پولیس۔ میرا پولیس کہنا تھا کہ اس چھوٹے سے کمرے کے
اندر زلزلہ سا آ گیا چونکہ پارٹی خلاف قانون تھی شاید دادا منصور کے کمرے کے اندر پارٹی
کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی۔ مجھے اندر سے مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں ایک کہہ رہا
تھا دادا آپ بوڑھے ہیں آپ پیچھے ہٹ جائیں میں آگے جاتا ہوں میں نوجوان ہوں دادا منصور
کہتے نہیں میں بوڑھا ہوں تو کیا میں زندگی کا تمام گرم سرد دیکھ چکا ہوں مجھے آگے جانے دو
میں اب باہر کھڑا اپنے مذاق پر بے حد شرمندہ ہو کر پسینے میں شرابور ہو رہا تھا نہ جائے ماندن
نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا اتنے میں دادا منصور نے کھانستے اور بلغم کا پٹاخہ چھوڑتے
ہوئے دروازہ کھولا تو مجھے اپنے سامنے دیکھ کر لاحول ولا قوۃ پڑھتے ہوئے کہا میں نے
تو پہلے ہی یار لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ یورش شیطان ہے مگر یہ لوگ مانتے ہی نہ تھے میں
جب کمرے کے اندر گیا تو دیکھا چائے کے پیالے لبالب میز پر پڑے ہوئے تھے اور چائے
کے پیالوں میں سے خوشبو آ رہی تھی دادا منصور نے چائے کا پیالہ مجھے بنا کر دیتے ہوئے کہا
یہ کیا بات ہے کہ یورش جب تمہارا ذکر آتا ہے تو تم فوراً شیطان کی طرح آن دھمکتے ہو میں
نے ہنس کر جواب دیا دادا جی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے خیر اس جواب پر آس پاس بیٹھے

ہوئے تمام لوگ ہنس پڑے دادا منصور کی رہنمائی اور پرخلوص دوستی ایک عجیب امتزاج کے ساتھ دل کو لبھاتی اور گرماتی تھی ان کی خوش مذاقی اور بدلہ سنجی ان کے قہقہے جہاں دوستوں کی محفلوں کو گرماتے وہاں ان کی خاموشی گرم جوشی محبت و شفقت کی تڑپ احباب کے دکھی دلوں کی آہوں اور آنسوؤں کا ساتھ دیتی وہ عوام کے سچے غمخوار تھے ان میں بناوٹ نام کو نہ تھی۔ انہوں نے برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس سلسلے میں رشتہ داروں نے رشتہ ناتے محبت توڑا ہمدردوں نے منہ موڑا مگر ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھی لغزش نہ آئی آپ نے مصیبتوں کو گلے لگایا اور طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے آپ ایسی بہاروں کو دائمی بنانا چاہتے تھے جن کے پہلو میں خزاں کی سسکیاں نہ ہوں دائمی خوشیوں کا عکس جھلکتا ہو وہ خود بھی انقلاب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے دوسروں کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے انہوں نے ساری عمر سرمایہ داری جاگیرداری کے خلاف جنگ لڑی۔ اور وہ مزدور انقلاب لانا چاہتے تھے مرتے دم تک اپنے عزم پر ڈٹے رہے سنا جیسے جیالے لوگوں کی بے پناہ قربانیوں سے ہمارا ملک آزاد ہوگیا اور غلامی کی فولادی زنجیریں ٹوٹ گئیں، انگریز بے پارہ بوریا بستر سمیٹ کر سمندر پار چلا گیا۔ دادا منصور نے دیکھا ملک کی مہاگ ڈور انگریز سامراج گماشتے جاگیرداروں کے ہاتھوں میں آگئی ہے وہ اسلام اور قرآن کے مقدس نام پر سادہ لوح عوام کو بیوقوف بنا کر شام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں تو آپ پھر میدان عمل میں نکل آئے مسلم لیگی جاگیردار حکومت نے آپ کو بار بار جیل کی کال کوٹھڑی میں بند کیا انگریز کی حکومت آپ کو جیل میں

اے کلاس دیتی تھی تو ان انگریز کے پروردہ حکمرانوں نے آپ کو جیل میں سی کلاس دی اور ملک آزاد ہونے کے بعد بھی جیل نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا وہ اکثر کہا کرتے تھے بچو میں نے جوانی کی راتیں جیل میں تارے گن گن کر گذاری ہیں اور میں اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین کی آزادی کے لئے لڑا ہوں، مگر آج بھی انگریز کا کالا قانون مجھے جیل کی کالی کوٹھڑی میں دھکیل دیتا ہے۔ دادا منصور کو دمہ کی بیماری بھی جیل سے ملی تھی۔ یہ بیماری ان کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹتی رہی یہ ایوب شاہی کے زمانے کی بات تھی، سارے ملک میں مارشل لاء کی سیاہ رات مسلط تھی میں اور میرا ایک دوست کافی ہاؤس کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک میکلوڈ روڈ پر رتن سینما کے سامنے دادا منصور سے ہماری ملاقات ہوئی میں نے خیر و عافیت پوچھتے ہوئے کہا دادا جی اب کے جیل کیسے کٹی کہنے لگے اچھی بڑی کٹ گئی وہ جیل سے تازہ تازہ رہا ہو کر آئے تھے میں نے پوچھا آپ آج کل کہاں مقیم ہیں، انہوں نے حمید ہاشمی کا پتہ بتایا دھوپ تیز تھی اور وہ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے میرے دوست نے دادا منصور کو اپنی آٹوگراف بک پیش کی تو انہوں نے اس پر اپنے دستخط ثبت کئے اور لکھا کہ اس حسین دنیا کو اور زیادہ حسین بناؤ، اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

# علامہ حسین میر کاشمیری

علامہ حسین میر کاشمیری مرحوم درمیانہ قد گندمی رنگ اور بھاری بدن رکھنے والے باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے شیروانی کے ساتھ سر پر رومی ٹوپی پھندنے والی پہنتے جس کا پھندنا ہمہ وقت لہراتا رہتا تھا آپ پاکستان بننے سے قبل امرتسر میں کٹڑہ کرم سنگھ گلی محمد شاہ میں رہتے تھے سیر و سیاحت کرتے ہوئے لاہور آئے اور مولانا ظفر علی خان کے اخبار زمیندار میں ملازم ہو گئے دور سے دیکھنے میں آپ سر سید احمد خاں کی کاربن کاپی لگتے تھے روزنامہ زمیندار میں مزاحیہ کالم کے ساتھ ساتھ انگریزی خبروں کا اردو میں ترجمہ بھی کرتے تھے۔ گفتگو ایسی مرصّع اور مسجع ہوتی کہ سُننے والے ان کی ذہانت و فطانت پر عش عش کر اٹھتے تھے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا جن دنوں وہ نیوز ایڈیٹر تھے اخبارات کا عملہ آج کی طرح وسیع نہیں

ہوتا تھا تاہم علامہ صاحب تن تنہا اخبار کا صفحہ مکمل و مرتب کر لیتے تھے۔

علامہ حسین میر کاشمیری ہر روز صبح سویرے امرتسر سے ریل گاڑی سے لاہور آتے سارا دن روزنامہ زمیندار میں ڈیوٹی دیتے اور شام کی گاڑی واپس امرتسر چلے جاتے تھے بعد ازاں "زمیندار" سے نوکری چھوڑ کر روزنامہ "انقلاب" میں چلے گئے ان کا کام ہر وقت لوگوں کو ہنسنا ہنسانا تھا ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ باتوں کے طوطے مینا بنا کر اڑانا ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ طبیعت کا شگفتہ پن آخر وقت تک رہا اس کے باوجود کہ وہ کئی برس تک فالج کے مریض رہے، انہوں نے ہنسنا ہنسانا کبھی ترک نہ کیا۔ وہ گل ہائے زنگارنگ کا ایک بوقلموں اور حسین جمیل مرقع تھے۔ ہر لحظہ مسکراتے، ہنستے اور قہقہوں کی بجلیاں گراتے تھے ان کی مجلس میں بیٹھ کر آدمی یوں محسوس کرتا جیسے زعفران کے کھیت میں داخل ہو گیا ہے کیا مجال کہ کوئی فقرہ زبان سے غلط نکل جائے، وہ قہقہوں کے شہنشاہ تھے۔ میں انہیں شہنشاہ ظرافت بھی کہتا تھا۔

علامہ صاحب بڑے خوش خوراک تھے، ہر روز کبھی مرغ کانفرنس کبھی بٹیر کانفرنس کبھی کباب کانفرنس کے نام پر احباب کی دعوتیں کرتے، خوش خوراکی کی محفلیں آئے دن، منعقد ہوتی تھیں۔ سیخ کباب مزے لے لے کر خود کھاتے اور دوسروں کو بھی زبردستی کھلاتے عام طور پر لاہور میں کباب کانفرنس عرب ہوٹل میں منعقد ہوا کرتی تھی جب عرب ہوٹل کی صحبتیں اجڑ گئیں اور یار لوگ ملازمتوں کے سلسلے میں دور دراز ملکوں میں چلے گئے تو عرب ہوٹل بھی عنقا ہو گیا۔ علامہ صاحب گوشہ نشین ہو گئے عمر کے آخری برسوں میں زعفرانی

طبیعت کے باوجود مرحوم دوستوں کو یاد کرتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ میں نے ان سے زیادہ دوستوں کو یاد کرنے والا دوست نہیں دیکھا وہ اپنے دوستوں کی بڑی عزت کرتے تھے ان کا تعارف نہایت دلفریب انداز میں کراتے اکثر کہا کرتے تھے کہ بھائی، میرے دوست ہی میرا سرمایہ ہیں۔

قدرت نے انہیں ایک خاص دماغی سانچے میں ڈھالا تھا وہ ایک نہ تھکنے والی روح تھے دوستوں کے دوست دل و جان سے تھے، مگر کسی کے وہ دشمن نہ تھے اور نہ کوئی ان کا دشمن تھا۔ سچی بات پٹھانوں کی طرح مسکراتے ہوئے کہہ دیا کرتے تھے شکل و صورت سے اور چال ڈھال میں سرتاپا شرع کے پابند نظر آتے موٹا جھوٹا پہننا اور وضع قطع میں مسلمان رہنا ان کا خصوصی امتیاز تھا مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور چودھری افضل حق کا بے حد احترام کرتے اکثر چودھری افضل حق سے لڑتے ہوئے کہتے تھے کہ تم لوگ تقریریں کر کے جیل جاتے ہو، مجھے تقریر نہیں کرنے دیتے اگر علامہ صاحب اخبار کے دفتر میں ہوتے تو تن تنہا چار چار پانچ پانچ کاتبوں کو بیک وقت مصروف رکھتے کسی جلسے میں چلے جاتے تو رونق بڑھا دیتے مجمع آپ کی ظرافت آمیز تقریریں سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

چودھری افضل حق آپ کو روکتے اور کہتے علامہ صاحب جیل بھگتنا آپ کے بس کی بات نہیں وہاں بڑی مصیبتیں اور ذلتیں اٹھانا پڑتی ہیں، مگر علامہ حسین میر نہ مانے آپ پشاور گئے وہاں کسی جلسے میں آپ نے سیاسی تقریر کر دی اور یوں گرفتار ہو کر جیل چلے گئے جب مجسٹریٹ کے سامنے

پیش ہوئے تو ضمانت پر رہانے سے انکار کر دیا لہذا انہیں بی کلاس دے کر کہا گیا آپ جیل میں دو چار روز رہ کر سوچ لیں کہ آپ کو ضمانت پر رہا ہونا ہے یا نہیں مجسٹریٹ نے دو چار روز کی آپ کو مہلت دی جب دوبارہ علامہ صاحب مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تو پھر دوبارہ ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دیا سی آئی ڈی سخت پریشان ہوئی انہوں نے آغا صاحب کی بی کلاس ختم کرادی تو آپ دوسرے روز ہی ضمانت پر رہا ہو کر لاہور چلے آئے جب چودھری افضل حق کے دفتر میں ملاقات کرنے کے لئے گئے تو چودھری صاحب بہت حیران ہوئے اور کہا علامہ صاحب، میں تو آپ کی ضمانت دینے کیلئے پشاور جا رہا تھا آپ واپس کیسے آگئے علامہ صاحب ہنس کر فرمانے لگے چھوڑ یار چودھری جیل بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے میں کہاں چلا گیا وہاں نہ تم نہ عرب ہوٹل نہ دوستوں کی محفلیں نہ سیخ کباب نہ ہنسی مذاق چاروں طرف اونچی اونچی بھوری دیواریں، لوہے کے جنگلے چپ چاپ موت کا سناٹا میں نے سوچا جب ہم باہر انگریز سے عدم تعاون کرتے ہیں تو جیل کا بھی عدم تعاون ہونا چاہئے انگریز بہادر نے کہا۔ جیل نہ جاؤ میں نے کہا ضرور جاؤنگا انگریز نے کہا جیل میں رہو گے میں نے کہا جیل میں میرا جوتا رہتا ہے لہذا میں جیل پر لعنت کے چار حرف بھیج کر چلا آیا ہوں مقصود تو انگریز کو خراب کرنا تھا سو وہ میں نے کر دیا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمتہ اللہ علیہ جماعت اہلحدیث کے رہنما تھے جو علامہ حسین میر کاشمیری کو تبلیغی کانفرنس میں دہلی اپنے ساتھ لے گئے جب گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی تو علامہ صاحب کو علم تھا کہ استقبال کرنے والوں کا ہجوم بے پناہ ہوگا، آپ فوراً مولوی

ثنا اللہ کا حجازی چغہ پہن کر ڈبے کے دروازے میں کھڑے ہو گئے مولانا ثناء اللہ مقابلتاً نحیف الجثہ تھے علامہ صاحب ان سے کہنے لگے مولانا لوگ جلوس نکال رہے ہیں۔ میں آپ کے لئے راستہ بناتا ہوں آپ فوراً اترنے کی کوشش کیجئے گا۔

ریل گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو ہجوم کے نعرہ ہائے تکبیر سے اسٹیشن کی فضا گونج اٹھی علامہ صاحب دونوں ہاتھوں سے دو طرفہ سلام کرتے جاتے تھے عام لوگ انہیں پہچانتے نہ تھے انہوں نے علامہ حسین میر کاشمیری ہی کو مولوی ثناء اللہ امرتسری سمجھ کر ہاروں سے لاد دیا اور جلوس بنا کر لے گئے ادھر مولانا ثناء اللہ بے چارے ڈبے میں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے جلوس یہ جا وہ جا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے علامہ حسین میر کاشمیری نے امرتسر کی ایک جنازگاہ میں ایک قابل اعتراض تقریر کی تقریر کرنے کے بعد جب وہ۔ ممبر سے اترے تو اپنے دوست مولوی صادق سے کہا یار مولوی میں نے غلطی سے سخت تقریر کر دی ہے" اور مجھے خطرہ ہے کہ میں گرفتار ہو جاؤں گا لہذا میری ضمانت کا بندوبست کر لو۔ مولوی صادق نے کہا علامہ صاحب آپ بے فکر رہیں میں آپ کی ضمانت کا مکمل بندوبست کر دونگا ابھی علامہ حسین میر کاشمیری جنازگاہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک خفیہ پولیس انسپکٹر نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے ان کا نام و پتہ پوچھا علامہ صاحب کو جو شرارت سوجھی فوراً امرتسر کے ایک مشہور عالم دین جناب مولانا بہاؤ الحق قاسمی کا نام ولدیت اور پتہ لکھوا دیا اور گھر چلے آئے تیسرے دن مولانا بہاؤ الحق قاسمی علامہ حسین میر کاشمیری کے پاس پہنچے اور کہا یار علامہ تیرا بیڑا غرق ہو تقریر تو تو نے کی اور نام پتہ

میرا لکھوا دیا اس لئے میرے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں علامہ نے مسکراتے ہوئے کہا مولانا یہ تو حسن اتفاق ہے وتعز من تشاء و تذل من تشاء میرا مولا جس کو چاہے عزت دیتا ہے جس کو چاہے ذلت دیتا ہے اس میں میرا کیا قصور ؟

میں نے تو آپ کے وارنٹ جاری نہیں کرائے خیر مولانا بہاول الحق قاسمی تین ماہ کے لئے بے گناہ جیل چلے گئے تین ماہ کی قید کاٹنے کے بعد جب وہ رہا ہو کر جیل سے باہر آئے تو علامہ حسین میر کاشمیری نے ایک بہت بڑا جلسہ کیا اور اس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انگریز قوم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتی ہے اور اپنے دفتری نظام کو دنیا کا بہترین اور منظم نظام سمجھتی ہے ۔ اس نظام کے اعلیٰ احکام کو ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ علامہ حسین میر کاشمیری کون ہے اور مولانا بہاول الحق قاسمی کون ہے ؟ ۔

تقریر تو جنازگاہ میں میں نے کی تھی لیکن پکڑے گئے بیچارے مولانا بہاول الحق قاسمی صاحب اور مفت میں تین ماہ جیل کی سزا کاٹ کر آئے ہیں ۔ یہ تو وہی بات ہوئی نا حضرت عیسٰے تو سولی سے اتر کر ساتویں آسمان پر خدا کے پاس چلے گئے ہیں لیکن انگریز بہادر ابھی تک بضد ہیں کہ حضرت مسیح مصلوب ہوئے ہیں ۔

اسی طرح ایک دفعہ یونیٹی کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی تو علامہ حسین میر کاشمیری پنجابی وفد کے سیکرٹری بن کر ساتھ گئے اس زمانے میں ریل گاڑی میں ریزرویشن کا کوئی سوال نہ تھا سبھی لیڈر سیکنڈ کلاس ڈبے میں سوار تھے ۔ راستے میں مختلف اسٹیشنوں پر اس وفد کا استقبال ہوتا رہا اور علامہ حسین میر کاشمیری اس وفد کی راستے میں خوب خاطر مدارت کرتے رہے مولانا ظفر علی خان

نے اپنا اور ساتھیوں کا ٹکٹ خریدنے کے لئے جو روپے علامہ صاحب کو دیئے تھے وہ سب روپے راستے میں انہوں نے اس وفد کی خاطر مدارات پر اڑا دیئے مگر آپ نے ٹکٹ لینے کے بجائے پلیٹ فارم خریدنے پر اکتفا کیا اور سارا سفر بغیر ٹکٹ کے کٹ گیا البتہ الہ آباد سے ایک یا دو اسٹیشن ادھر تمام وفد کے ٹکٹ بنوالئے جب اسٹیشن سے باہر نکل کر علامہ حسین میر کاشمیری کی اس حرکت کا پتہ چلا تو وفد کے تمام لوگ ششدر رہ گئے مگر علامہ صاحب قہقہے لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

ان کی ظرافت طبع کا یہ عالم تھا کہ اپنی بیوی کی موت پر انتہائی مغموم تھے عزیز رشتے دار وغیرہ کفن پر گیری سے قرآنی آیات لکھوانے لگے تو علامہ حسین میر کاشمیری کی رگ ظرافت پھڑکی نہایت سنجیدگی سے فرمایا بھائی پارسل پر پتہ صحیح لکھنا کہیں غلط پتہ لکھنے پر اللہ میاں پارسل واپس نہ کر دیں غرض ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ایک دفعہ ان کے دوستوں نے بہت مجبور کیا کہ علامہ صاحب دعوت کریں پہلے انکار کرتے رہے، بعد میں مان گئے سب دوستوں کو دعوت پر بلایا اور انہیں کمرے میں بٹھا کر باہر سے تالا لگا کر جالندھر چلے گئے احباب کچھ دیر تک علامہ صاحب اور ان کے کھانے کا انتظار کرتے رہے بعد میں محلے والوں کو پتہ چلا تو انہوں نے تالا توڑ کر مہمانوں کو رہا کیا۔

علامہ صاحب آئے دن نئی سے نئی سوچتے تھے ایک مرتبہ جو شرارت سوجھی تو لاہور ڈاکخانہ میں بطور تفریح طبع کلرک بھرتی ہو گئے اور لفافوں سے ٹکٹیں اتار اتار کر انہیں بیچ بیچ کر اس پاس والوں کی خاطر تواضع کا حق ادا کرتے رہتے جب کوئی علامہ صاحب سے پوچھتا کہ مولانا،

آپ کے پاس اتنی رقم کہاں سے آتی ہے جو آپ فراغ دلی سے مہمان نوازی پر خرچ کرتے ہیں
علامہ صاحب مسکرا کر فرماتے! فلاں ریاست کا کرتا دھرتا ہوں مجھے کرنے کے لئے کوئی کام
نہیں ہے اس لئے یکسانیت کو توڑنے اور محض جی بہلانے کے لئے یہاں ملازم ہو گیا ہوں ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ نوکری اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیتے بھائی میں تو پیسے کو ہاتھ کا میل
سمجھتا ہوں آخر ایک روز علامہ کی طبیعت وہاں سے بھی اچاٹ ہو گئی نوکری چھوڑ کر جب
وہاں سے آنے لگے تو ان کی جگہ جو سکھ کلرک آیا تھا وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور آپ سے خوشحال
بننے کا نسخہ دریافت کرنے لگا آپ نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر مُسے میں اپنا سدری نسخہ
یعنی ٹکیٹیں اتار کر بیچنے کا گر بتا دیا سردار جی علامہ حسین کا شمیری کے صدری نسخے پر عمل کرتے اور
آپ کے نقش قدم پر چلتے رہے کچھ دن تک تو انہوں نے خوب موج اڑائی آخر بکرے کی ماں کب تک
خیر مناتی ایک روز سردار جی رنگے ہاتھوں پکڑے گئے، انہیں ہتھکڑی لگی اور وہ جیل کی ہوا کھانے لگے۔
امرتسر میں مولوی محمد صادق علامہ حسین کا شمیری کے جگری دوست تھے دونوں کی آپس میں
خوب بنتی تھی ایک روز علامہ صاحب نے مولوی محمد صادق سے کہا مولانا مرغ کا نفرنس ہونا
چاہیے۔ مولوی محمد صادق کے چھوٹے بھائی محمد اسلم نے ایک موٹا تازہ مرغ پال رکھا تھا مولوی
محمد صادق نے محمد اسلم سے کہا بھائی اسلم، اپنا مرغ مجھے دے دو اور مجھ سے اس کے پیسے لے
لو مگر محمد اسلم نہ مانا اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بھائی یہ مرغ اصیل ہے اور میں نے
اسے بڑی محبت اور محنت سے پالا ہے میں اسے ہرگز نہ دوں گا مولوی محمد صادق نے محمد اسلم کو
پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا یار اسلم تم باز آ جاؤ اپنا مرغ میرے ہاتھ بیچ دو اور پیسے

لے لو۔ مگر محمد اسلم نہ مانا تب مولوی محمد صادق نے کہا اسلم تمہارا مرغ حلال ہوگا اور ضرور ہوگا اور خود تمہارے ہاتھوں سے ہوگا اور تم بھی ہمارے ساتھ یہ مرغ کھاؤ گے مگر اسلم نے مولوی محمد صادق کی ایک نہ مانی۔

ایک ماہ کے بعد مرغ کانفرنس منعقد ہوئی مولوی محمد صادق نے آٹھ دس مرغے منگوائے اور اس کے ساتھ ہی محمد اسلم کا بھی مرغ حلال کرا دیا محمد اسلم کو مولوی محمد صادق کی اس چال کا پتہ نہ چلا مولوی محمد صادق نے محمد اسلم کے ہاتھ سے اپنے دوستوں کو دعوت نامہ بھجوایا دعوت نامے کے نیچے یہ مصرعہ لکھا ہوا تھا۔ ع: "لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" اب یہ دعوت نامے محمد اسلم نے سب دوستوں میں بانٹ دیئے رات کو تمام دوست جمع ہوئے انہوں نے مرغ کی دعوت خوب اڑائی جب کھانا کھا چکے تو منتظم ہونے کی وجہ سے محمد اسلم آخر میں کھانے لگے مولوی محمد صادق نے علامہ حسین میر کاشمیری سے درخواست کی کہ مرغ کانفرنس کی صدارتی تقریر ہونی چاہیے علامہ صاحب نے پہلے تو مرغ کانفرنس کی خوب خوب تعریف کی پھر بعد میں کہا میں اس خوبصورت دعوت کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مولوی محمد صادق کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اتنی اچھی دعوتیں کیا کریں مولوی صادق اٹھے اور کہا میں اس دعوت کی مبارک باد کا ہرگز مستحق نہیں بلکہ اس دعوت کی مبارک باد کا مستحق میرا چھوٹا بھائی محمد اسلم ہے جس نے نہ صرف اپنا جوان قیمتی مرغ اس دعوت کے لئے قربان کیا، بلکہ ایک ایک دوست کے گھر خود جا کر دعوت نامے بھی تقسیم کئے ہیں۔

اس وقت محمد اسلم مرغ کی ٹانگ پکڑے روٹی کے ساتھ کھا رہا تھا اس نے جب

سُناکہ اس کا مرغ بھی دعوت میں حلال ہو گیا ہے تو وہ ہولناک چیخ مار کر اٹھا اور پاگلوں کی ، طرح چلاتا ہوا تمام کمروں میں اپنے مرغ کو ڈھونڈنے لگا اور ساتھ ہی رونے لگا کہ ہائے میرا حسین مرغ ظالموں نے حلال کر دیا اس کے شور مچانے پر تمام محفل ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی علامہ حسین میر کاشمیری نے کہا بھائی اسلم، اب صبر کرو اللہ میاں کو یہی منظور تھا کہ یہ مرغ قوم پر قربان ہو جائے اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے آہ مرغ بے چارہ تمہارے پیٹ میں چلا گیا بڑا ہی خوبصورت تھا تمہارا مرغ اب ہو بھی کیا سکتا ہے ! اسلم میں تمہارے جوانمرگ مرغ کے غم میں نہایت عمدہ مرثیہ کہوں گا تم فکر نہ کرو۔

محمد اسلم نے اپنے مرغ کے غم میں دو دن تک روٹی نہ کھائی۔

علامہ حسین میر کاشمیری موڈ میں ہوتے تو یہ شعر گنگنایا کرتے تھے ؎

تعریف اس خدا کی جس نے پلاؤ بنایا
کیسی بنائی بوٹی کیا شوربا بنایا

# ساغر صدیقی

میں ساغر صدیقی مرحوم کو چچا غالب سے بڑا شاعر مانتا ہوں اس لحاظ سے نہیں کہ وہ میرا دوست تھا۔ بلکہ اس لحاظ سے چچا غالب کے پاس اپنا گھر نہ تھا مگر اپنا بوریا بستر تو تھا لیکن میرے اس دوست شاعر کے پاس نہ تو گھر تھا نہ بوریا بستر،

ساغر صدیقی سے میری ملاقات کہاں ہوئی اور کب ہوئی یہ مجھے یاد نہیں البتہ یہ بہت پرانی بات مگر وہ جب پہلی بار ملا تھا اس کا وہ خلوص اب تک یاد ہے اور فاقہ کشی کے زمانے میں بھی اس کے پیار اور خلوص میں کوئی کمی نہ آئی جب میں کراچی سے دو سال کے بعد لاہور آیا تو میں نے اپنے یار دوستوں سے پوچھا کہ ساغر صدیقی کہاں ہے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا وہ تو خانہ بدوش ہے یونہی سر راہ ہے ملے گا۔

میں ایک روز استاد دامن سے ملنے جا رہا تھا کہ اچانک مجھے کسی نے آواز دی میں نے پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا ساغر صدیقی جھومتے جھامتے چلے آ رہے ہیں میں انہیں دیکھتے ہی بغل گیر ہو گیا میں ان کی خستہ خراب حالت دیکھ کر دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا مجھے وہ پرانے ساغر صدیقی نہ دکھائی دے رہے تھے۔ جنہیں میں دو سال قبل چھوڑ کر کراچی گیا تھا اب ان کے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے گریباں چاک اور آنکھوں میں چمک کی بجائے جلے ہوئے سگریٹوں کی راکھ وہ برہنہ پا تھے میں نے ان سے کہا ساغر بھائی آپ نے یہ کیا ناکام عاشق کا حلیہ بنا رکھا ہے وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔" کیا بتاؤں دوست اس ظالم دنیا نے مجھ سے اچھا سلوک نہیں کیا" وہ اپنی ناکامیوں کی داستان سنانے لگے۔ میں نے ان سے کہا چلو استاد دامن کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں وہ افسردہ ہو کر کہنے لگے نہیں بھائی، وہاں چلنے کی بجائے تم میرے ساتھ چلو تو اچھا ہے مجھے ایک پبلشر سے کچھ پیسے لینے ہیں اس سے پیسے لے کر کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھیں گے۔

چونکہ میں ایک مدت کے بعد ساغر سے ملا تھا اس لئے میں نے انکار کرنا مناسب نہ سمجھا ہم دونوں وہاں سے پیدل چل کر ٹکسالی سے پیسہ اخبار بازار میں پہنچ گئے پھر وہ مجھے مشرقی ہوٹل کے قریب کھڑا کر کے ایک چھوٹی سی گلی میں گھس گئے پھر وہ پندرہ بیس منٹ بعد واپس آئے تو ان کی مٹھی میں ایک روپے مالیت کے ٹیڈی پیسے دبے ہوئے تھے میں نے یہ ریزگاری دیکھ کر ازراہ تفنن کہا، ساغر بھائی، یہ کہاں سے بھیک مانگ کر لاتے ہو؟ وہ پھیکی ہنسی ہنس کر کہنے لگے " حضرت یہ بھیک نہیں یہ تو میری تنخواہ ہے جو اسی طرح بھیک کی صورت میں ملتی ہے پھر کہنے لگے چھوڑو یار۔ اس بحث کو، چلو میں کر کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں پھر ہم

چائے پینے کے لئے قریبی ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی ساغر صدیقی نے سگریٹ سلگا لیا پھر بڑبڑانے لگے، یار لوگ مجھ سے فلموں کے لئے گیت لکھوا کر لے جاتے ہیں میرے ساتھ بے انصافی کرتے ہیں، کوئی میرے گیتوں کا معقول معاوضہ نہیں دیتا اور مزا یہ کہ گیت پر اپنا نام ٹانک دیتے ہیں یہ سب لوگ میری کھال اتارنے کی فکر میں رہتے ہیں یہ لوگ فراڈ ہیں میرے سامنے آتے ہیں اخلاقیات کی لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں لیکن فلمی صنعت کی خدمت کے نام پر مجھے بھوکا مارتے ہیں جیب کترے ہیں دن کی روشنی میں جیب کاٹتے ہیں میں بھی اس وقت اپنی قدر و قیمت کو بھول کر ان کے نرم ملائم اور دلکش لفظوں میں کھو جاتا ہوں۔

وہ باتیں کرتے جا رہے تھے لیکن مجھے ان کے الفاظ دہکتے ہوئے انگارے ان کے قہقہے خون میں لتھڑے ہوئے اور ان کے آنسو بجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے پھر وہ مجھے نصیحت کرنے لگے "دیکھ بھائی" اپنی زندگی یونہی تباہ برباد نہ کریں میں نے مردہ دلوں میں روح پھونکی، میں نے اپنی جوانی کو روگ لگا لیا۔ مجھے ادب کی خدمت کا صلہ ملا ہے میرے پاس کھانے کو روٹی ہے نہ سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ پھر وہ کہنے لگے مسٹر قمر یورش میری باتیں آج تمہیں بُری لگ رہی ہوں گی مگر جب تم کل میری طرح خون تھوکتے ہوئے اپنے کندھے پر ناکام حسرتوں کا جنازہ اٹھائے پھرو گے تو پھر تم پچھتاؤ گے پھر وہ بیدم وارثی کا یہ شعر گنگنانے لگے۔

تمہاری مشق ستم کی یہ یادگار رہے
کہ ہم رہیں نہ ہمارا کہیں مزار رہے

تھوڑی دیر بعد وہ سامنے والی نکڑ کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہنے لگے وہ سامنے چوبارے

میں پاکستان بننے کے قبل میں رہتا تھا اوپر والے حصے میں آغا شورش کاشمیری، وہ یہاں سے مال روڈ پر چلے گئے میں آج ملک میں آزادی کے بعد بھی فٹ پاتھوں پر دھکے کھا رہا ہوں میرے پاس دھوپ بارش سردی گرمی سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

میں نے بات کا رُخ بدل کر پوچھا ساغر بھائی اپنے دوست ہمایوں کاشمیری سے بھی کبھی ملاقات ہوتی ہے؟

ہمایوں کاشمیری کا نام سنتے ہی ساغر صدیقی یوں گم سُم ہو گئے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو میں نے ساغر صدیقی کو ذرا جھنجھوڑ کر پوچھا کہاں پہنچ گئے کہیں اللہ میاں سے تار تو نہیں مل گئی۔"

"کیا بتاؤں دوست اس جاہل ہمایوں کاشمیری کے بارے میں انہوں نے کہا میں نے حیرت سے پوچھا۔

حضرت خیریت تو ہے۔

"ہاں خیریت ہے۔"

میں نے ذرا تجسس سے پوچھا "آخر کیا ہوا کچھ پتہ تو چلے۔"

ساغر صدیقی سر جھٹک کر بولے، تو سن لو اس شخص کی بات یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں نشہ کرتا ہوں ایک دن میں اسی نشے کی بدولت رام گلی کے بدنام ٹھکانے پر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا پہلے حوالات پہنچا بعد میں جیل، ساغر صدیقی جسے علم و ادب کی دنیا کے علاوہ زمانہ جانتا تھا مگر اس موقع پر میری مدد کو کوئی نہ پہنچا، میں ایک عام حوالاتی کی طرح جیل سے لاہور ڈسٹرکٹ

کورٹ میں تاریخ بھگتنے کے لئے آتا تھا لیکن لاہور ایسے تاریخی علم و ادب کے گہوارے میں میری ضمانت تو ایک طرف رہی کوئی سگریٹ صابن اور گرد شیں کے ساتھ میری ملاقات کو نہ پہنچا صرف آتا تو ہمایوں کاشمیری۔

میں نے نعرہ تحسین بلند کرتے ہوئے کہا شاباش ہمایوں کاشمیری صد آفریں ہے کہ تو ساغر صدیقی کا وفادار دوست ثابت ہوا۔

ساغر صدیقی پھر شگرم کہنے لگے، یار پہلے پوری بات تو سن لے پھر اس کی جی بھر کے تعریف کرنا تمہیں کیا پتہ کہ اس نے میرے خلاف کیا سازش کی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ سازش؟

ساغر صدیقی نے گلا صاف کرتے ہوئے ایک ماہر داستان گو کی طرح کہانی کے دھاگے جوڑ کر کہا "اللہ خوش رکھے ہمایوں کاشمیری کو پیشی پر موجود ہوتا اپنی استطاعت کے مطابق میری خدمت کرتا اس طرح دن ہفتوں میں بدلتے رہے میں ہتھکڑی لگے میلے کچیلے کپڑوں اور ننگے پاؤں تاریخیں بھگتتا رہا۔ حسب معمول ہمایوں کاشمیری چائے سگریٹ سے میری خاطر تواضع کرتا پہلے تو میں اس کے اس ایثار پر فخر کرتا رہا مگر بعد میں ایک روز مجھے غصہ آگیا میں نے سوچا یہ شخص میرے ساتھ مخلص نہیں، پھر کیا تھا میرے دماغ کا میٹر خراب ہوگیا اور میرے غصے کا پارہ ہائی ڈگری پر چلا گیا میں۔

ہمایوں کاشمیری پر بگڑ گیا ڈسٹرکٹ کورٹ میں میں نے اسے گالیاں دیں اور ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ لیا اور کہا ہمایوں کاشمیری، تم یہاں ہر پیشی پر صرف اس لئے آتے ہو کہ میری بے بسی کا تماشا دیکھ سکو۔ تم ہی ہو جو مجھے اس بدحالی میں دیکھ کر خوش ہوتے ہو تم اگر میرے ہمدرد

ہوتے تو میری گرفتاری کی اخباروں میں خبر چھپوا سکتے تھے تم میرے ہمدرد نہیں ہو میری گرفتاری کی خبر اس لئے نہیں چھپواتے کہ خبر چھپنے کے بعد لوگ میری مدد کو آئیں گے اور مجھے اس مصیبت سے چھڑا لے جائیں گے اور بعد میں تم میری بے بسی کا تماشا نہ دیکھ سکو گے تم خوش ہو کہ میں جیل میں ہوں تم آزاد شاد پھر رہے ہو کہاں ہیں وہ تمہارے وکیل دوست کہاں ہیں تمہارے حلقے کے بااثر افراد، تم نیک نہیں بددیانت دوست ہو۔

میرے اس ہنگامے پر ایک ہجوم جمع ہو گیا ساغر صدیقی کہنے لگے۔

میں ہمایوں کاشمیری کا گریبان جھنجھوڑتا رہا مگر حیرت اس بات کی تھی اس شخص پر ذرا بھی اثر نہ ہوا بلکہ وہ طوطے کی آنکھ والا شخص نہایت ڈھٹائی سے کہتا رہا، ساغر صاحب آپ نشہ چھوڑ دیں میں ابھی آپ کی ضمانت کرا دیتا ہوں وہ مجھ سے وعدہ لینا چاہتا تھا میں نے دیکھا وہ سختی سے نہیں مانے گا تو پھر میں نے نرمی اختیار کی اور ہمایوں کاشمیری کو احساس دلایا کہ بابا جیل دنیا میں ایک عذاب ہے خدا کے واسطے مجھے اس جہنم سے نجات دلاؤ تم سب کچھ کر سکتے ہو مگر میری ضمانت کرانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے میں نے اسے خدا رسول کا واسطہ دے کر کہا مجھے جیل سے چھڑا دو مگر اس طوطا چشم نے میری ایک بات نہ مانی بلکہ ایک ہی رٹ لگائی کہ میں نشہ چھوڑ دوں میں بڑا برہم ہوا اور کہا کہ نشہ تو میرے شعور کی عینک ہے میں اس کے بغیر اندھا ہوں میں نشہ نہیں چھوڑ سکتا پھر ہمایوں کاشمیری کہنے لگا اگر نشہ نہیں چھوڑنا تو پھر جیتے کیوں ہو اب پھانکو جیل کی خاک، اب ملاؤ مٹی میں اپنی زندگی کو میں نے اب تمہاری ضمانت کرا دی تو پھر تم باہر آ کے نشہ کرو گے یہ تو ایک چکر ہے جو کسی کے رکنے سے بھی نہیں رک سکتا اسے تو

تم ہی روک سکتے ہو میں نے ہمایوں کاشمیری کو بہت یقین دلانے کی کوششیں کیں کہ میں نشہ چھوڑ دوں گا آخر میں میں نے اس سے نرم لہجے میں کہا تم تو میرے شہزادے ہو تم تو میرے چاند ہو خدا کی قسم اگر میں کچھ دن اور جیل میں رہا تو میں مر جاؤں گا میں نے اسے جیل کے ماحول کے متعلق بتایا کہ وہاں بھی پینے والوں کی حکومت ہوتی ہے ۔

میں وہاں سگریٹ تیل صابن گڑ کے لئے ترستا ہوں میں نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا خدا کی قسم میں باہر آ کر نشہ کرنا چھوڑ دوں گا جیل والوں نے کڑوی کسیلی تیزابی قسم کی دوائیں پلا پلا کر میرا حلق سینہ اور معدہ جلا کر رکھ دیا ہے ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مجھے عدالت سے آواز پڑی میں پیش ہوا اور چار یوم کی تاریخ پڑ گئی ۔

ہمایوں کاشمیری نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں آئندہ پیشی پر پھر آنے کا وعدہ کیا اور میں جیل چلا گیا تمہیں کیا بتاؤں اس ہمایوں کاشمیری کی کرم فرمائیاں اس نے پروگرام بنایا کہ مجھے جیل کی بجائے لاہور کے پاگل خانے میں نشہ کے علاج کے لئے داخل کرایا جائے چار روز کے بعد ہمایوں کاشمیری پھر پیشی پر پہنچا اور ایک درخواست مجسٹریٹ کے نام میری طرف سے لکھی اور دھوکے سے اس پر میرے دستخط کروالئے ۔ میں نے جب پوچھا میاں یہ کیسی درخواست ہے تو اس نے جواب دیا کہ ضمانت کی ہے اور میں نے بغیر پڑھے دوست کے اعتماد پر دستخط کر دیئے دراصل یہ درخواست میری ضمانت کی نہیں بلکہ میرے پاگل خانے بھجوانے کی تھی اس میں درج تھا جناب والا میں عرصہ تیس سال سے منشیات کا عادی ہوں لہذا علاج کے لئے مجھے پاگل خانے بھیج دیا جائے ۔ میں نے ہمایوں کاشمیری کی سازش نہ سمجھتے ہوئے کہا ہمایوں کاشمیری تو واقعی خلوص و محبت کا نشان

ہے تجھے دیکھ کر میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں دنیا میں لاوارث نہیں ہوں واقعی تو میرا چاند ہے بھائی تم تو خواہ مخواہ مجھ سے منہ پھیر رہے تھے میرے چاند میرے سورج میں وعدہ کرتا ہوں میں جیل سے نکلتے ہی نشہ چھوڑ دوں گا ہاں بھئی پتہ ہے کہ ہمایوں کاشمیری نے کیا کہا، کہنے لگا مولانا جب تمہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو بجائے بحث کرنے کے کہنا کہ جو کچھ درخواست پر لکھا ہے وہ مہربانی فرما کر منظور کیا جائے ہاں مولانا اور کچھ نہ بولنا ورنہ کام خراب ہو جائے گا میں نے کہا ہمایوں کاشمیری تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہمایوں کاشمیری نے یہ درخواست وکیل کی معرفت عدالت میں پیش کر دی تھوڑی دیر بعد عدالت کے طلب کرنے پر میرے ساتھ۔ ہمایوں کاشمیری اور ان کے دوست وکیل بھی پیش ہوئے عدالت کے سامنے درخواست پیش ہوئی جسے پڑھنے کے بعد مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا ساغر صدیقی تم کب سے نشہ کرتے ہو میرا یہ شن کر ماتھا ٹھنکا ساغر صدیقی نے کہا خدا بھلا کرے تمہارا یور آنر بھائی، میں نے عدالت میں جو بیان دیا وہ بھی تاریخی تھا اللہ میرا جانتا ہے میں نے اپنے جواب میں اعتراف کرتے ہوئے کہا جی ہاں، حضور والا میں نے نشہ کیا ہے میں پکڑا گیا ہوں جو نشہ بیچتے ہیں وہ آزاد ہیں میں نے عدالت سے پوچھا مجھے کیوں پکڑا گیا ہے کیا میرے پکڑنے سے ملک سے نشہ کی لعنت ختم ہو گئی ہے نہیں یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی کوئی اپنا غم غلط کرنے کے لئے شراب پیتا ہے کوئی چرس کوئی افیون کوئی گانجا کوئی کوکین، میں پوچھتا ہوں یہ غم کہاں سے آیا ہے اس غم کا منبع کہاں ہے اسے تباہ کر دو ملک سے تمام برائی خود بخود مٹ جائے گی کئی پاؤں گھنگرو باندھنے پر مجبور ہیں کئی بھوکے پیٹ عصمت فروشی پر کئی معصوم بچے سردیوں کی کہر آلود راتوں میں چائے خانوں میں جھوٹے برتن دھونے پر مجبور ہیں۔

"صرف تڑپنے کے"

میں ایک مجبور انسان ہوں۔ سوائے تڑپنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہوں مجھے یہی غم ہے جسے میں غلط کرنے کے لئے نشہ کرتا ہوں۔ عدالت نے میرے اس جذباتی بیان سے متاثر ہو کر پوچھا کوئی اور بات میں نے عاجزی سے جواب دیا بس اتنا ہی کافی ہے مجسٹریٹ نے کہا عدالت تمہاری التجا منظور کرتی ہے اور تمہیں پاگل خانے بھیجنے کا حکم دیتی ہے میں نے اپنے پاگل خانے کا حکم سنا تو میرے ہوش اڑ گئے میں نے زور سے چلا کر کہا جناب والا یہ تو آپ انصاف نہیں کر رہے بلکہ آپ انصاف کا خون کر رہے ہیں یہ اچھا انصاف ہے کہ کوئی آپ سے انسانیت کے نام پر ضمانت کی درخواست پیش کرے تو آپ اسے جیل سے رہا کرنے کی بجائے پاگل خانے بھجوا دیں یہ انصاف نہیں ظلم ہے جناب والا میں نے درخواست اپنی ضمانت پر رہائی کے لئے دی تھی پاگل خانے جانے کے لئے ہرگز نہیں دی تھی عدالت نے جواب میں صرف اتنا پوچھا درخواست پر تمہارے دستخط ہیں میں نے کہا جی ہاں تو پھر پاگل خانے سے کیوں گھبراتے ہو وہاں تو تمہارا علاج ہوگا اور نشہ بھی چھوٹ جائے گا تم ایک اچھے شاعر ہو وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی البتہ مفت میں تمہارا دماغ بھی درست ہو جائے گا میں نے کہا صاحب بابا میں پاگل خانے نہیں جاتا یورش بھائی خدا کے لئے تم ہی بتاؤ پاگل خانہ بھی کوئی تفریحی مقام ہے جہاں جا کر انسان کا دل بہل جاتا ہے میں اڑ گیا میں نے درخواست ضمانت کے لئے دی ہے پاگل خانے جانے کے لئے ہرگز نہیں دی تھی میرے منہ سے بار بار ضمانت کا سن کر مجسٹریٹ نے درخواست میری طرف بڑھا دی اور کہا عدالت درخواست پر حکم دینے کی بجائے تمہیں اس پر غور کرنے کے لئے ایک گھنٹے کی مہلت

دیتا ہے میں نے ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے ہاتھوں سے درخواست تھامی اور عدالت سے باہر برآمدے میں بیٹھ کر پڑھی پڑھنے کے بعد میں آپے سے باہر ہو گیا میں نے ہمایوں کاشمیری کو گالیاں دینی شروع کر دیں میں نے کہا دجال ہمایوں کاشمیری میں نے تمہیں اس لئے قلم پکڑنا سکھایا تھا جس کا صلہ تم نے یہ دیا ہاں تم یہ چاہتے ہو میں پاگل خانے میں مر جاؤں اور میرا تمام کلام تم اپنے نام سے شائع کرا کر گیا بتاؤں یار وہ عاجزی سے کہنے لگا ساغر صاحب، میں شاعر نہیں ہوں میں صرف آپ کا ادنیٰ سا خدمت گار ہوں کلام آپ کا ہے فکر آپ کا ہے خدا کی قسم میری نیت پر شک نہ کرو میں آپ کو صحیح معنوں میں انسان دیکھنا چاہتا ہوں آپ عوامی شاعر ہیں آپ کی جان کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے میں نے تلخ لہجے میں کہا ٹھیک ہے تم نے فرض ادا کرتے ہوئے جیل سے پاگل خانے بھجوانے کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی میں نے اس کمبخت کو ڈانٹتے ہوئے کہا بس بس مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے میں ابھی عدالت میں جا کر کہوں گا کہ ہمایوں کاشمیری نے مجھ سے دھوکے سے دستخط کروائے ہیں میرے منہ سے یہ فیصلہ سن کر ہمایوں کاشمیری کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں پھر اس شریف آدمی نے میری ضمانت کرا دی کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے اب تم ہی بتاؤ یورش...... بھائی ہمایوں کاشمیری نے کیا شیطانی چکر چلایا وہ تو ہاتھ کا لیا دیا کام آ گیا ورنہ ابھی تک پاگل خانے کی ہوا کھا رہا ہوتا۔

ساغر صدیقی اپنے دوستوں کو الفاظ کے شیشے میں اتارنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور وہ بھی شاید اس لئے کہ قسمت کی بدحالی نے انہیں بھیک مانگنے اور شعر بیچنے پر مجبور کر دیا تھا جب پیسے کی ضرورت محسوس کرتے تو ہمایوں کاشمیری کی طرف رخ کرتے اور اسے دور سے دیکھتے

ہی فوراً کہہ اٹھتے شہزادے تمہیں دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئی تھیں لوگ ظالم ہیں فقیر کی کوئی قدر نہیں کرتے اگر ہمایوں کاشمیری خود کو بھوکٹ ظاہر کرتا تو ساغر صدیقی ہمایوں کاشمیری کو فوراً شہزادے کے القاب سے جاہل کاشمیری کہنا شروع کر دیتے لیکن جب ساغر صدیقی کی مٹھی گرم ہو جاتی تو فوراً یہ دو شعر ہمایوں کاشمیری کو لکھ دیتے۔

اخلاق و محبت کی روایات کا منظر
آنکھوں سے تراشیدہ حکایات کا منظر
ماتھے پہ چمکتے ہوئے آداب کے تارے
دامن میں سمیٹتے ہوئے احباب کے تارے

پھر وہ ہمایوں کاشمیری سے کہتے۔ لوگ فقیر کی لاش کو بے گور و کفن سڑک پر گھسیٹنا چاہتے ہیں تم ان کو ایسا نہ کرنے دینا میرے لال کہتے ہوئے ہمایوں کاشمیری کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے بنا عذر صدیقی اپنی راہ لیتے۔

میں نے ان کی طلسم ہوشربا جیسی داستانیں سن کر ایک روز فرمائش کی کہ ساغر صاحب آپ کی وہ دو نظمیں بہت مشہور ہیں وہ تو سنائیں۔

بھئی کون سی، ساغر صدیقی نے اپنے مختصر جسم کو گٹھڑی کی صورت میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

میں نے عرض کیا ایک نظم بہار دوسری کوئلے چننے والی لڑکیاں، پہلے تو انہوں نے رسمی انکار کیا پھر ترنم سے دونوں نظمیں سنائیں اب ساغر صدیقی کی نکھری آواز میں کھانسی شامل ہو چکی تھی وہ پہلا سا دم خم نہ تھا مگر پھر بھی یہ دونوں نظمیں ان کی رسیلی آواز میں کافی پرلطف

رہیں میں کئی خوش گلو لوگوں سے ملا ہوں اور لالہ گل کے خمیر میں گندھے ہوئے ہونٹوں شہد میں ڈوبی ہوئی آوازوں کا بھی لطف اٹھایا ہے مگر جو لطف اس وقت ساغر صدیقی کی آواز کا آیا وہ کبھی نہ آیا تھا ساغر صدیقی نے اپنی آواز اور کلام کے جادو کا ایسا سماں باندھا جس سے فضا جھوم اٹھی تھی پھر وہ خوشبو دار گرم میٹھی چائے کی چسکیاں لینے لگے ساغر صدیقی اب ختم ہو چکے تھے۔ اب ان کے گال پچکے ہوئے تھے ان کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں ان کی آنکھوں کی چمک تاریک غاروں میں چھپ گئی تھی وہ ایک پھول تھے جو خزاں کی آغوش میں پڑے ہوئے مرجھا رہے تھے اتنے میں ساغر صدیقی کو ایک دم کھانسی کا دورہ پڑا وہ کھانستے ہوئے نڈھال ہو گئے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے سینے کے اندر روح کا پنچھی پھڑپھڑا رہا تھا اور آزاد ہونا چاہتا تھا وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر باہر چلے گئے میں سوچنے لگا ساغر صدیقی اب چراغ سحری ہے اس کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا اگر اب بھی وہ لوگ جو ادب کی خدمت کے نام پر فن کاروں کی ہڈیوں اور خون کے گارے سے اپنی بلند عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں اگر اس عوامی شاعر کی مدد کریں تو یقیناً کچھ مدت تک یہ شاعر موت کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اس ملاقات کے چند دن بعد سنا کہ ساغر صدیقی اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔

ساغر صدیقی کی موت پر ان کا ایک شعر یاد آیا۔

ہمارے چاک گریباں سے کھیلنے والے
ہمیں بہار کا سورج سلام کرتا ہے

# عبدالحمید عدمؔ

شاعرِ رِندان سید عبدالحمید عدمؔ سے میری پہلی ملاقات آج سے بیس سال پہلے میاں یعقوب الحسن مدیر "خضرِ راہ" کے دفتر میں ہوئی تھی اس سے قبل میرا اُن سے غائبانہ تعارف تھا میاں یعقوب صاحب نے عدمؔ صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہ شاعرِ خرابات سیّد عبدالحمید عدمؔ ہیں یہ میرے بڑے مخلص دوست ہیں۔ عظیم شاعر ہی نہیں، عظیم انسان بھی ہیں، پھر میرا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا! یہ میرا یار قمر یورش افسانہ نگار پھر میاں یعقوب نے مجھ سے کہا " دوستی کے اعتبار سے تم عدمؔ میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ پاؤ گے پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے " بھئی میں تو دوستی پر کچھ زیادہ ایمان نہیں رکھتا کیونکہ زندگی میں جن لوگوں کے ہاتھوں میں نے زیادہ نقصان اٹھایا ہے، وہ میرے دوست ہی ہیں مگر عدمؔ کی دوستی

پر مجھے فخر ہے"

ہم دونوں بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے سامنے جھکے اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر تجسس آمیز نظروں اور بڑی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے گلے ملنے کے بعد باتیں کرنے لگے۔

میں نے عدم کی حسین وجمیل غزلیں پڑھ کر ان کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا جس کے مطابق وہ دھان پان پستہ قد گورے چٹے نوجوان لکھنوی انداز کے شاعر تھے۔ پھول دار شیروانی، سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے، اور منہ میں پان کی گلوری دبائے نستعلیق قسم کے جو بات بات پر کہیں گے "واہ کیا عمدہ شعر کہا ہے" اب میں ان سے ملا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا عدم مجھے شاعر رومان کی بجائے اچھے خاصے باڈی بلڈر کے باز یا ناسخ کی طرح پہلوان نظر آ رہے تھے۔ سانولا رنگ، دیوقامت میں انھیں دیکھ کر بہت حیران ہوا وہ مجھے ہرگز شاعر نظر نہ آتے تھے۔ میں ان کی بڑی تعریف سن چکا تھا کہ وہ بڑے خوبصورت شاعر اور بے حد دوست نواز ہیں ان کے پاس روپے پیسے کی بھی کمی نہیں وہ دوستوں پر دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے ہیں وغیرہ وغیرہ

میں عدم کی شخصیت کا سرسری جائزہ لینے لگا وہ مجھے رستم زماں گاماں پہلوان کے شاگرد نظر آتے تھے ان کا گول چہرہ بچوں کی طرح معصوم تھا۔ ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی بعد کی ملاقاتوں سے پتہ چلا وہ واقعی جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں عدم صاحب عجز انکساری کا مجسمہ تھے بات بات پر ہاتھ جوڑتے انھیں اپنی بڑائی کا کوئی غرور نہ تھا اکثر قمیص پاجامے میں دفتر آتے اور کبھی کبھی سوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے۔ مگران کے سوٹ کا کپڑا

ہمیشہ قیمتی اور نایاب ہوتا تھا جب وہ محفل رنداں میں آتے تو دو چار سو روپے جیب میں ڈال کر آتے خود پیتے، دوستوں کو پلاتے تھے جب پی لیتے تو بُلبل ہزار داستاں بن جاتے کبھی کبھی ان ساتھی عالم سرور میں انھیں دیکھتے تو ان کی جیب پر بھی ہاتھ صاف کر دیتے تھے عدم کو پتہ چلتا تو وہ رونے لگتے، وہ روتے ہوئے بھی بہت معصوم اور خوبصورت دکھائی دیتے تھے جیسے کوئی بچہ اپنا کھلونا گم ہو جانے سے روتا ہے۔

میں جب اداس ہوتا تو جی بہلانے کے لئے عدم کے پاس چلا جاتا تھا وہاں میں طرح طرح کی باتیں سنتا علم وادب کی باتیں سائنس کی باتیں نغموں اور گیتوں کی باتیں اور پر مسرت زندگی کی باتیں جنہیں سن کر میری روح میں تازگی آتی اور طبیعت گلاب کے پھول کی طرح کھل جاتی تھی میں پینے پلانے کے کام میں عدم کا ساتھی نہ تھا میں صرف اُن کے عالم سرور و کیف کی گپ شپ سُننے کے لئے اُن کی محفل میں شریک ہوتا تھا وہاں سعادت حسن منٹو کا ایک دوست عزیز عرف جیجا غنڈہ بھی آتا تھا سعادت حسن منٹو نے اس پہ ایک افسانہ بھی لکھا ہے یہ جیجا غنڈا بڑا خونخوار قسم کا تھا۔

عدم کی محفل بھی عجیب تھی۔ یہاں ہر طرز اور ہر وضع کا آدمی بے تکلفی سے آتا تھا ان میں اعلیٰ ادنیٰ کوئی نہ تھا سب سے برابری کا سلوک ہوتا۔ ایک روز میں ان کی محفل میں گیا تو دیکھا دو خوبصورت اور خوش پوش نوجوان مرغا بنے ہوئے ہیں اور ظہیر کاشمیری اُن کی جوتوں سے پٹائی کر رہے ہیں اور قریب ہی میاں لیعسوب ایک کرسی پر ٹانگ رکھے بیٹھے سگریٹ پیتے ایبر مغاں بنے مسکرا رہے ہیں۔

میں نے جاتے ہی پوچھا بھئی یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے میاں یعسوب نے کہا یہ قوم کے غدار ہیں، اظہیر کاشمیری کہنے لگے ان بچھوڑوں نے عدمؔ کی جیب صاف کر دی ہے اور پانچ سو روپے نکال لئے ہیں۔

" تیرا اللہ سے پانچ سو روپے اسی وقت مل گئے۔

عدمؔ کو مناظر فطرت سے عشق تھا جب شام کو آسمان پر پھیلی ہوئی لالہ گوں شفق یا رات کو چاندنی کا نکھار دیکھتے تو اُن پر مدہوشی طاری ہو جاتی، اُس وقت وہ بن پیئے جھومنے لگتے۔ عدمؔ تمام دوستوں کا کام بڑی فراخ دلی سے کرتے تھے ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ قمر یورش اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو بلا تکلف بتانا۔ دیکھنا جھجکنا نہیں ہم لوگ آپس میں ہڈیاں پسلیاں ہیں میں نے کہا اچھا جی کبھی کام ہوا تو حاضر خدمت ہو جاؤں گا عدمؔ صاحب کے کئی ملنے والے ان کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان سے دغا بھی کر جاتے تھے مگر عدمؔ سب پر جان نثار کرتے تھے، وہ ان دنوں ملٹری اکاؤنٹنٹ آفس میں ڈپٹی اکاؤنٹ جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ میں ایک دوست کے کام کے سلسلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا جناب عدمؔ صاحب یہ میرے دوست اصغر صاحب ہیں آپ مہربانی کر کے ان کی ضمانت دے دیں یہ انگلینڈ جانا چاہتے ہیں۔

عدمؔ کہنے لگے۔ میں تمہارے دوست کو نہیں جانتا میں تو تمہیں جانتا ہوں انہوں نے اسی وقت نہ صرف ہمارا کام کیا بلکہ، چائے پانی سے ہماری خوب خاطر تواضع بھی کی پھر ہاتھ جوڑ کر بڑی انکساری سے کہنے لگے۔ قمر یورش آئندہ بھی کوئی کام ہو تو بلا تکلف چلے آنا

مجھے اپنا بھائی سمجھنا۔

یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی نشانی تھی وہ دوسروں کے کام کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے اور موقع ملتا تو پیدل ہی چل پڑتے تھے گرمی کا موسم تھا۔

آسمان پر کالے کالے بادل امڈ آئے اور خنک ہوا تند فراٹے بھرنے لگی، شام کے وقت "بیں خضرراہ" کے دفتر گیا تو وہاں پر یاران محفل کی ٹولی جمی ہوئی تھی، ظہیر کاشمیری خیال امروہوی انور علیمی، عدم، میاں یعسوب اور دوسرے دوست موجود تھے میاں یعسوب نے کمرے سے باہر جھانک کر کہا ہائے موسم تو قاتلانہ ہے میں ابھی کچھ منگواتا ہوں پھر وہ خود تیزی سے باہر چلے گئے، جب وہ واپس آئے تو ان کا تھیلا بھرا ہوا تھا اتنی دیر میں آسمان پر سیاہ بادل اور بھی گہرے ہو گئے ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے اس کے دروازے سے باہر کا سارا منظر صاف دکھائی دیتا تھا، یکایک بجلی چلی گئی چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا، بجلی چمکتی تو آس پاس کا ماحول چمک اٹھتا اور پھر گہری تاریکی میں ڈوب جاتا رم جھم ہونے کا امکان تھا میاں یعسوب نے میز پر تین چار موم بتیاں جلا لیں، موم بتیوں کی روشنی میں یہ ماحول بڑا رومانی اور پُر اسرار لگنے لگا، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب لوگ میرے لئے اجنبی ہیں میں نے ان لوگوں کو کہیں دیکھا ضرور ہے مگر یہ کون ہیں۔ میں نہیں بتا سکتا اس احساس نے مجھے کس قدر خوف زدہ کر دیا تھا مگر عین اسی لمحے آسمان پر اتنے زور سے بجلی کڑکی کہ چونک پڑا اور پھر جیسے یاران محفل ایک سہانے خواب کی طرح دکھائی دینے لگی۔

عدم بہت حساس تھے ان کے احساسات بے حد لطیف تھے اتنے لطیف کہ ایک اچھا شعر انہیں ہفتوں تڑپانے کی قدرت رکھتا تھا گوئٹے، شیلے، شیکسپیئر، بائرن، ورڈزورتھ کیٹس، عمر خیام، غالب، حافظ، ذوق، ناسخ، حالی، بیدل کے انھیں سینکڑوں شعر ان کی نوک زبان تھے، جب وہ عالم مدہوشی میں ہوتے تو شراب و شباب کے موضوع پر بے تکان شعر سناتے چلے جاتے، ایک دن آہ بھر کر کہنے لگے، آہ تمام میری عمر فائلوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئی۔ کاش میں کسی غنچہ دہن کے ساتھ کسی مرغزار میں بیٹھا ہوا بہار کے گیت گاتا اور ستاروں کے سپنے بنتا۔ پھر کچھ رک کر بولے مگر یار یہ محفل بھی بری نہیں ہے۔ یہ یاران میکدہ کی محفل کتنی دلفریب ہے، یہ جام ہائے ارغوانی کا دور، یہ رسیلے قہقہے یہ میٹھے نغمے اور یہ مخلص پیارے دوستوں کا قرب۔ اے کاش یہ محفل سدا بہار رہے تو میں اپنی تمام دولت دے کر بھی مسرت کے چند لازوال لمحے اپنے دوستوں کے لئے خرید سکوں یہ کہہ کر انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کسی بے نام لذت سے چور ہو کر جھومنے لگے عدم کے اٹھنے بیٹھنے اور باتیں کرنے کا انداز قلندرانہ تھا خاص طور پہ جب وہ باتیں کرتے تو ان کی بھویں آنکھیں اور چہرے کا ہر نقش ان کی آواز پر رقص کرنے لگتا۔ جب آسمان پہ کالے کالے بادل امڈ آتے اور بارش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی فضا میں خنکی پیدا ہوتی تو عدم بے قرار ہو جاتے اور خواہ مخواہ لڑکھڑانے لگتے وہ روزانہ بے شمار غزلیں کہنے کے باوجود دہائی دیتے تھے کہ میری سرکاری نوکری میری شاعری کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے جب وہ موڈ میں ہوتے تو بڑے پرسوز لیسے شعر کہتے کہ روح میں بے قراری سی پیدا ہونے لگتی، فطرت سے ان کا لگاؤ

مجھے بے حد پسند تھا بلکہ میری ان کی دوستی کی بنیاد ہی ان حسین خوابوں پر تھی جو ہم اکٹھے دیکھا کرتے تھے وہ خواب بہتر زندگی کے، امن اور مسرت کے خواب تھے، انسان کے روشن مستقبل خواب جو گینوں سے زیادہ میٹھے اور شبنم سے زیادہ دلکش ہوتے تھے۔ ان کے پاس رسیلے قہقہے تھے۔ نغمے تھے رنگین اشعار تھے بہاریں بہار تھا جب وہ اس پھیکی اور کھوکھلی اور بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے نغموں کے شعروں کے رنگا رنگ پھول کھلاتے تو وہ خوش ہوتے تھے وہ کوشش کرتے کہ ان حسین ورنگین پھولوں کی تازگی اور رعنائی پر خزاں کا منحوس سایہ نہ پڑے جب اس محفل میں کوئی اڑچن پیدا ہو تو عدم اپنے شاداب ہونٹوں پر ایک پُر نور مسکراہٹ لاکر دوستوں سے کہتے "حضور، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب تک یہ غلام زندہ ہے"

اس رات بھی جب بجلی آگئی تو وقت بہت ہو گیا تھا شب کی زلفیں بھیگ چکی تھیں میاں یعسوب اور ظہیر کاشمیری نے میرے خلاف سازش کی اور میری ڈیوٹی لگائی کہ میں عدم کو اُن کے گھر چھوڑ کر آؤں۔ مدہوش عدم کو قابو کرنا بدمست ہاتھی کو قابو کرنے کے برابر تھا لیکن قہر درویش برجان درویش میں عدم کو ساتھ لے کر میکلوڈ روڈ پر آگیا لاہور ہوٹل کے قریب ہمیں ایک تانگے والا ملا اس نے فرشی سلام کر کے پوچھا حضور کہاں جائیں گے، عدم نے بڑی شان بے نیازی سے پوچھا "چھاؤنی" کوچوان نے کہا دس روپے کرایہ ہوگا۔ ہم نے سالم تانگہ لیا عدم اگلی سیٹ اور میں پچھلی سیٹ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے پھرتی سے چابک سنبھال کر گھوڑے کو چمکارا اور تانگہ اسٹیشن کا موڑ کاٹ کر علامہ اقبال روڈ پر چلنے لگا چاروں طرف جگمگاتی بتیوں کا جال پھیلا ہوا تھا راستے میں کئی انجانے چہرے دم بھر کے لئے ابھرتے اور

رنگارنگ روشنیوں میں دمک کر اندھیروں میں ڈوب جاتے دور سے چہرے مجھے رنگارنگ

کے فانوسوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جو ہاتھ سے نکلتے ہی آسمان طرف پرواز کر جاتے ہیں۔

فضا میں ایک عجیب سناٹا پھیلا ہوا تھا کبھی کبھی ناقابل فہم آوازیں لہروں کی طرح فضا میں

ابھرتیں اور آہستہ آہستہ ڈوب جاتیں یہ نظارہ میرے دل میں ایک کسک پیدا کر رہا تھا جب تانگہ

دھرم پورہ نہر کے پل کے قریب پہنچا تو وہاں دودھیا رنگ کی روشنی کا سیلاب اُمڈ رہا تھا

بھیڑ بھاڑ زیادہ نہ تھی لوگ خاموشی سے آجا رہے تھے۔ اور جگمگاتے ہوئے قمقموں کی روشنی

میں اُن کے چہرے بڑے پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ عدمؔ نے ایک پنواڑی کی دوکان پر

تانگہ رکوایا میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ عدمؔ نے کہا ایک کوکا کولا کی بوتل پینی ہے میں نے کوکا کولا

کی بوتل لی اور عدم کو پکڑا دی پھر عدمؔ نے کہا ایک بوتل تم پیو گے، تب میں چونکا میں نے اپنے

لئے ایک بوتل اور لے لی، پھر عدمؔ نے کہا ایک بوتل کوچوان پیئے گا۔ تب میں چونکا میں نے ایک

بوتل کوچوان کو بھی لے کر دی۔ پھر عدمؔ نے کہا ایک بوتل گھوڑا پیئے گا تب میں چونکا میں سمجھ

گیا کہ عدمؔ صاحب شرارت پر تل گئے ہیں میں نے عدم کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا عدم صاحب

تماشا نہ بنیں لوگ تانگہ کے گرد جمع ہو گئے ہیں، جلدی سے پیسے نکالیے پنواڑی آپ کو نہیں

جانتا کہ آپ شاعر عدم ہیں وہ ایسے ہی مجھے غنڈہ دکھائی دیتا ہے وہ آپ کو پیسے نہ دینے

پر اٹھا کر نہر میں پھینک دے گا، پھر آپ آرام سے عدم آباد پہنچ جائیں گے، یہ سُن کر عدم نے

دس روپے کا نوٹ نکالا اور اس پنواڑی کو دیا۔ اب مصیبت یہ آپڑی تھی کہ عدم بقیہ پیسے واپس

نہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے پنواڑی سے پیسے لے کر زبردستی عدمؔ کی جیب میں ڈالے اور تانگہ

لے کر آگے چلا گیا میرے دل میں یہ خدشہ تھا شاید عدم کی جیب میں پرمٹ نہ ہو اور ہم پکڑے
جائیں ۔ رات حوالات میں رہنا پڑے ٹھیک ہے صبح ضمانت تو ہو جاتی مگر یہ سب مصیبت
تو تھی آخر چلتے ہوئے عدم کی کوٹھی آ گئی ۔ ہم تانگے سے اترے کوچوان کو کرایہ دیا جب عدم
نے ڈرتے ڈرتے اپنی کوٹھی کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ان کا چھوٹا لڑکا نکلا
عدم نشے کی حالت میں اپنے چھوٹے کے سامنے نہایت مظلوم بن کر ادب سے ہاتھ جوڑ کر
کھڑے ہو گئے اور روتے ہوئے اپنے لڑکے سے کہنے لگے "میں تو پیتا ہی نہ تھا" پھر میری طرف
اشارہ کر کے کہنے لگے ۔ "اس شخص نے مجھے زبردستی پلائی ہے" اور ساتھ ہی کوٹ کی جیب
سے مٹھی بھر نوٹ نکال کر اپنے بیٹے کو دکھانے لگے کہ میرے پاس پیسے بھی ہیں ۔ ان کا چھوٹا
صاحبزادہ مجھے اور میاں لیعسوب کو تڑا تڑ گالیاں دینے لگا میں وہاں سے گالیاں کھا کر چپکے
سے کھسک آیا ۔ میری عدم سے آخری ملاقات دوپہر کے وقت انارکلی بازار میں ہوئی وہ
اپنی بیگم کے ساتھ انارکلی میں خریداری کے لئے جا رہے تھے آگے آگے بیگم صاحبہ تھیں اور
پیچھے عدم بڑے فرمانبردار قسم کے شوہر کی طرح جا رہے تھے اب ان کی صحت بری طرح
گر چکی تھی ۔ وہ سوکھ کر بالکل ہڈیوں ڈھانچہ رہ گئے تھے البتہ چہرے پر ویسی ہی معصومیت
تھی وہ اپنی بیگم کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر یوں چل رہے تھے جیسے کوئی خلانورد
چاند کی زمین پر چل رہا ہو مجھے جو شرارت سوجھی میں نے عدم کے کوٹ کا دامن کھینچ کر کہا "
زن مرید عدم جا رہا ہے" پھر کیا تھا اتنا کہنے کی دیر تھی جیسے بارود میں آگ لگ گئی عدم
نے شور مچانا شروع کر دیا ۔ بھگت کبیر کی طرح مرلاہے رونے لگے آس پاس کے لوگ

جمع ہوگئے میں دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا لوگوں نے یہ سمجھا بڑے میاں کی جیب کٹ گئی جو رو رہے ہیں، کسی نے پوچھا بڑے میاں کیا بات کیا ہے کیوں رو رہے ہو ان کی بیگم نے بھی پوچھا بات کیا ہے کیوں آپ شور مچا رہے ہیں عدم صاحب نے روتے ہوئے کہا وہ بدمعاش قمر یورش مجھے کہتا ہے عدم زن مرید جا رہا ہے عدم کے منہ سے یہ فقرے سن کر تمام، لوگ ہنسنے لگے بیگم کہنے لگیں۔ ہو دفع کرو اس بات کو آپ کو شرم نہیں آتی ایسی بات کہتے ہوئے۔ عدم بگھر گئے وہ بضد تھے کہ قمر یورش نے مجھے زن مرید کیوں کہا یہ ہوتا کون ہے ایسی بات کہنے والا پھر ان کی بیگم بڑی مشکل سے عدم کو سمجھا بجھا کر انہیں اپنے ساتھ لے گئیں اس کے بعد میری عدم سے ملاقات نہ ہو سکی۔

ایک روز احمد ندیم قاسمی صاحب نے بتایا کہ عدم نے شراب چھوڑ دی یہ بیسویں صدی کا معجزہ تھا مجھے یقین نہ آتا تھا کہ عدم صاحب ایسا چائے پی رہے ہیں۔

پھر ایک روز خالد احمد نے بتایا عدم نے ڈاڑھی رکھ لی ہے اور آجکل کثرت سے نمازیں پڑھ رہے ہیں اچانک ایک روز اخبار میں پڑھا کہ وہ اس فانی دنیا سے انتقال فرما گئے ہیں۔

یہ خبر مجھ پر ایٹم بم کی طرح گری میں کبھی کبھی عدم کو چڑانے کے لئے کہتا تھا۔

اب شہر میں جی نہیں لگتا
عدم جی عدم آباد چلو

اور وہ واقعی عدم آباد چلے گئے دور افق کے اس پار ستاروں سے بھی آگے جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا میں آج انہیں یاد کر کے اکیلا اداس بیٹھا ہوں۔

# اُستاد دامن

پچیس سال پہلے کا ذکر ہے۔

میں کتب خانہ افغانی میں بیٹھا کتابیں دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں ایک چوڑے بدن اور میانے قد کا ایک دیہاتی آیا وہ سفید کرتے اور تہہ بند میں ملبوس تھا۔ اس کے کندھے پر سفید رومال پڑا تھا میں نے اس دیہاتی کے کسرتی جسم گٹھے ہوئے سر اور مڑے تڑے ہوئے کان دیکھ کر اندازہ لگایا کہ یہ شخص ضرور گوجرانوالے کا کوئی نامور پہلوان ہوگا۔ جو لاہور میں یا تو کشتی لڑنے یا اصلی شہنشاہی دنگل دیکھنے آیا ہوگا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ شخص کون ہے؟ جو پہلوان ہوتے ہوئے بھی کتابوں کا رسیا ہے، اتنے میں کتب خانہ افغانی کا ملازم فقیر حسین عزیز آیا اس نے بڑے ادب و احترام سے اس دیہاتی سے علیک سلیک کی۔ بعد میں وہ دیہاتی بھی میرے ساتھ بڑی دلچسپی

سے کتابیں دیکھنے لگا۔ میں نے اشارے سے فقیر حسین سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ فقیر حسین عزیز نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا کیا تم استاد دامن سے متعارف نہیں ہو میں نے جواب دیا غائبانہ تعارف تو بہت دیر کا ہے مگر ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ پھر فقیر حسین عزیز نے اس دیہاتی سے تعارف کراتے ہوئے کہا آپ ہیں استاد دامن پنجابی کے مشہور و معروف شاعر جن کے قلم میں پانچ دریاؤں کی روانی ہے۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ میرے دوست مزدور افسانہ نگار قمر یورش ہیں۔

میں نے استاد دامن سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا" جناب استاد صاحب بہت مدّت سے آپ کو دیکھنے اور ملنے کی آرزو تھی"

استاد دامن نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی میں ان کے دردولت پر حاضر ہوا استاد ٹیکسالی دروازے کی ایک چھوٹی سی قدیم مسجد کے نیچے ایک چھوٹے حجرے میں مقیم تھے پھر میری ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں بعد میں یہ ملاقاتیں دوستی کے سانچے میں ڈھل گئیں مجھے بہت جلد پتہ چل گیا کہ استاد دامن جسے میں عام شاعروں اور اپنی طرح کا اَن پڑھ آدمی سمجھتا تھا وہ تو علم و ادب کا گہرا سمندر ہے، برصغیر پاک و ہند کی چلتی پھرتی زندہ تاریخ اس کی زبان پر تھی۔ میں نے استاد دامن میں بیحد خلوص پایا۔ نہایت سادہ طبیعت ہنس مکھ اور ملنسار۔ ان کے حجرے میں ہر وقت فنکاروں کا ہجوم رہتا وہ ہر ایک سے اس طرح گھل مل کر ملتے جیسے بہت پرانے دوست ہوں میں استاد دامن کے ہاں دوستوں سمیت جاتا اور ان کے ساتھ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو بحث کرتا بعض دفعہ بحث اتنا طول کھینچتی

کر آدھی آدھی رات ہو جاتی۔ استاد دامن فر فر کتابوں کے حوالے دیتے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے۔ علم و ادب کے ہیرے موتی لٹاتے۔ اور اپنی زندگی کے قیمتی تجربات بھی پیش کرتے مجھے یہ حقیقت ہے کہ میں نے ان قدموں میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا۔ وہ اکثر اٹھتے بیٹھتے مجھے کوئی نہ کوئی بات بتلاتے رہتے۔

استاد فرماتے ہیں "زمین چکر کھاتی ہے، رات دن بنتے رہتے ہیں اور عمر رواں سوتے جاگتے کسی حالت میں دم نہیں لیتی، کٹ جاتی ہے انسان عرصہ دراز تک دنیا کی دلآویزی میں سرشار سمجھتا ہے کہ عمر بڑھ رہی ہے۔ لیکن کبھی نہ کبھی ایک وقت آتا ہے ضرور آتا ہے جب انسان کی آنکھ کھلتی ہے اور دفعتہً اسے احساس ہوتا ہے کہ عمر بڑھ نہیں رہی گھٹ رہی ہے یہ احساس پیدا ہوتے ہی دل و دماغ بدل جاتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ماحول ہی نہیں تمام عالم بدل جاتا ہے۔

استاد دامن کے دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے بالکل سمندر کی طرح پھیلا ہوا ہے ان کے دوست ٹولیوں کی صورت میں آتے ہیں۔ طلبا کی ٹولی گئی، سیاستدانوں کی ٹولی آگئی، وہ گئی تو فنکاروں کی ٹولی آگئی۔ استاد فن گفتار کے ماہر ہیں محفل جمی ہوئی ہے خوب گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ ساتھ سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی چائے کا دور بھی چل رہا ہے اور استاد اپنے مخصوص انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ ہمارے ساتھ بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے دوست محمد اسلم مذنب کے ساتھ استاد دامن کے ہاں شام کے چار بجے گیا میری اور محمد اسلم مذنب کی استاد سے بڑی

زبردست بحث چھڑ گئی شام کے چار بجے کی بحث جو چھڑ گئی ہمیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا رات آدھی سے زیادہ بیت گئی بحث تھی کہ شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بحث نہ ختم ہونے کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہم اٹھ کر گئے تو ہمارا وقار ختم ہو جائے گا، ہمیں ذلت آمیز شکست ہوگی اور ہماری ناک کٹ جائے گی۔

میں نے استاد دامن سے پوچھا! استاد ذرا وقت تو بتلایئے استاد نے گھڑی دیکھ کر کہا صرف دو بجے ہیں رات کے دو بجے کا سن کر ہم نے کہا آج ہم بے موت مارے جائیں گے۔

دو بجے کا سن کر واقعی ہمارے ہوش اڑ گئے یہ علاقہ بازار حسن کا تھا ہمیں خطرہ تھا کہ آدھی رات کے وقت کہیں پولیس والے ہمیں بازار حسن کے تماشبین سمجھ کر دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی میں نہ دھر لیں اور صبح کے اخبارات میں بڑے ٹھاٹ سے خبر چھپی ہو۔ مسمی قمر یورش اپنے ایک عدد ساتھی کے ہمراہ بازار حسن میں داد دیتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے۔

بہر حال ہم استاد دامن کے حجرے سے نکل کر گھر کی طرف پیدل چل دیئے ہمیں حجرے کے اندر بیٹھے خبر ہی نہ ہوئی شب کا قافلہ دبے دبے پاؤں گزر گیا۔ شہر کے ہنگامے دم توڑ چکے تھے گلیوں بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ اور سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ یکا یک گھڑیال نے دو بجائے آسمان پر ستاروں کی کافوری قندیلیں روشن تھیں کبھی کبھی دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ اپنے کسی خیالی دشمنوں پر بھونک رہے تھے ہم اپنے دل میں اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتے چلے جا رہے تھے۔ قدم قدم پر ہمیں چوکیدار روک کر پوچھتے پھر چھوڑ دیتے خدا کا شکر ہے ہم بخیر و عافیت اپنے محلے میں پہنچ گئے۔

جان بچی سو لاکھوں پائے، لوٹ کے بدھو گھر کو آئے ہم ابھی اپنی گلی میں داخل ہوئے ہی تھے میرے آگے محمد اسلم مذنب جا رہا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اس کا باپ سخت پریشان کھڑا اپنے بیٹے کا شدت سے انتظار کر رہا تھا اس کے باپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ ایک چھتر محمد اسلم مذنب کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا "اوئے آدھی رات ہو گئی تو اب تک کہاں تھا؟ محمد اسلم مذنب نے بڑے تحمل سے گال سہلاتے ہوئے کہا۔ ابا جی میں تو سیرت النبیؐ کا جلسہ سننے گیا ہوا تھا۔ اسی طرح بچارے محمد اسلم کی جان بچی، ایک روز استاد دامن کے حجرے میں محفل شباب پر تھی میں نے استاد کی کسی بات پر اختلاف کیا۔ استاد چڑ گئے اور کہنے لگے لو جی کل کے لونڈے مجھے سمجھانے آگئے ہیں، میں نے استاد دامن سے بڑے ادب و احترام سے کہا جناب استاد صاحب آپ میرے بڑے قابل احترام بزرگ ہیں۔ مگر جو آپ بات کر رہے ہیں یہ غلط ہے پھر کیا تھا، جیسے بارود میں چنگاری گر گئی، استاد غصے میں آگ بگولا ہو گئے۔ ادھر میرا پارہ بھی ہائی ڈگری پر چلا گیا میں بھی آپے سے باہر ہو گیا میں نے کہا استاد جی آپ ڈکٹیٹر ہیں آپ نے اس چھوٹے سے حجرے میں ڈکٹیٹر شپ قائم کر رکھی ہے اور میری ساری عمر ڈکٹیٹر شپ کے خلاف لڑتے ہوئے گزری ہے۔ میری یہ بات سن کر استاد خاموش ہو گئے۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے، قمر یورش تو کتنا پڑھا ہوا ہے" میں نے بڑی انکساری سے جواب دیا۔ صرف دو جماعت تیسری جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ میرے دماغ میں آوارگی بھری ہوئی تھی۔ میں آگے نہیں پڑھ سکا اب جو کچھ میں نے سیکھا۔ وہ آپ جیسے بزرگوں کے جوتوں میں بیٹھ کر سیکھا ہے۔ باقی مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں میں تو کندۂ ناتراش ہوں۔

استاد دامن کا میرے متعلق خیال تھا کہ میں بہت پڑھا لکھا شخص ہوں شاید میری جیب میں کچھ ڈگریاں بھی ہوں گی۔ اس لئے میں ان کی قابلیت کو چیلنج کر رہا ہوں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ استاد میری صاف گوئی دیکھ کر خاموش ہو گئے اس دن کے بعد استاد کے ہاں میرا آنا جانا بند ہو گیا تقریباً چھ ماہ تک ان کے ہاں نہ گیا۔ ایک روز استاد سے میری ملاقات سرراہ ہوئی انہوں نے پھر دوبارہ اپنے ہاں آنے کی دعوت دی میں نے کہا چھوڑیئے استاد صاحب آپ بھی بچوں کی طرح بات بات پر روٹھ جاتے ہیں۔ استاد نے مجھے پیار محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ بیٹا دیکھو بزرگوں سے بغاوت کرنا تمہارا پیدائشی حق ہے مگر اس کے ساتھ ہی بزرگوں کا احترام کرنا بھی تمہارا فرض ہے۔

میں پھر استاد دامن کے ہاں آنے جانے لگا۔ استاد بڑے تپاک سے ملتے۔ اب ہماری دوستی پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی تھی، میں جب بھی مہینہ پندرہ دن استاد کے ہاں نہ جاتا تو وہ پیغام بھیج کر بلا لیتے تھے۔

۱۹۶۶ء کا ذکر ہے، میں جیل میں نظر بند تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت اچانک جیل میں میری ملاقات استاد دامن سے ہو گئی استاد کے ساتھ جیلر بھی تھا۔ استاد گلے ملے جیلر نے استاد دامن کو میرے ساتھ ملتے دیکھا تو وہ سخت پریشان ہوا۔ استاد نے جیلر کو پریشان دیکھ کر کہا جیلر صاحب آپ گھبرائیں نہیں اگر قمر یورش کے ساتھ مجھے بیس سال بھی قید کاٹنا پڑی تو میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ استاد دامن جیل میں پھانسی گھر دیکھنے آئے تھے۔ اور مجھے بھی زبردستی پھانسی گھر دکھانے کے لئے ساتھ لے گئے۔

استاد دامن بنیادی طور پر ایک حساس دل فطری شاعر ہیں ۔۔۔۔۔ کسے خبر تھی سید وارث شاہ بلھے شاہ، سلطان باہو، احمد یار، فضل شاہ کے بعد پانچ دریاؤں کی اس دھرتی میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا؟ جو پنجابی شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دے گا ۔ یہ حقیقت ہے استاد دامن نے پنجابی شاعروں کو انقلابی لہجہ عطا کیا ہے ۔ استاد دامن کو فطرت نے بات کرنے کا ایک نہایت دلاویز انداز بخشا ہے کہ جس سے ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے ۔ زبان کے ساتھ خیالات بھی انقلابی ہیں استاد دامن شاعر انقلاب ہیں اور ان کی زندگی سراپا انقلاب ہے ۔ آپ جس فضا میں پیدا ہوئے اس وقت برصغیر پاک و ہند کے افق پر غلامی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے ۔

استاد دامن نے لاہور کے ایک محنت کش گھرانے میں آنکھ کھولی، پھر باغبان پورے چلے گئے ۔ آپ کو بچپن سے لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق تھا ۔ مگر آپ کی بستی میں کوئی سکول نہ تھا ۔ اس لئے استاد دامن کئی میل چلچلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں پیدل چل کر لاہور آتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے مختلف حادثات کی ٹھوکریں کھاتے اور کئی سکول بدلنے کے بعد استاد دامن نے میٹرک پاس کر ہی لیا ۔ اس اثنا میں آپ کے والد بزرگوار بھی فانی دنیا سے کوچ کر گئے ۔ تھوڑے عرصے میں آپ کی شادی ہو گی اور استاد کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا ۔ اس زمانے میں انقلابی تحریک زوروں پر تھی استاد دامن نے ملک کی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا ۔ اور انگریز سامراج کے خلاف جلسوں میں نظمیں پڑھنے لگے ایک روز پولیس نے آپ کو ایک جلسے میں باغیانہ نظم پڑھنے کے جرم میں گرفتار کر کے پس دیوار زنداں بھیج دیا ۔ سرکار برطانیہ کا خیال تھا جیل میں استاد کی اچھی خاصی اصلاح ہو جائے گی ۔ مگر اس کے برعکس استاد دامن کے سینے میں

انگریزی سامراج کے خلاف نفرت کی دبی ہوئی چنگاری شعلۂ جوالہ بن گئی۔ سرکار برطانیہ کے جانی دشمن ہو گئے۔ استاد دامن اس گوری شہنشاہیت کے دشمن ہوئے جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ جیل سے آئے تو آپ کے بیوی بچے فوت ہو چکے تھے۔ اب کوئی بیڑی ان کے پاؤں میں نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے کھلم کھلا انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد شروع کر دی کئی مرتبہ ملک کی آزادی کی خاطر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیئے گئے۔ استاد نے زمانے میں بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ پہلے آزادی کی چاہت میں کئی خار زار راستے طے کئے۔ اس راستے میں کئی مصیبتیں آئیں کئی آندھیاں آئیں کئی طوفان آئے آپ کے کئی ساتھی پھانسی کا جھولا جھول گئے کئی مشین گنوں کی گولیوں کا شکار ہوئے کئی کئی برس جیلوں کی خاک پھانکتے اور خون تھوکتے تہہ خاک ہو گئے۔ آئے دن استاد کو بھی پولیس کے تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ مگر کیا مجال جوان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش آئی ہو۔ آخر ملک انگریزی سامراج کی غلامی سے آزاد ہوا آزادی کا گلنار سورج طلوع ہوا تو اکثر لوگ ہندوؤں کی کروڑوں روپوں کی جائیداد پر قبضہ کر کے لکھ پتی کروڑ پتی ہو گئے مگر استاد دامن کی اپنی جھولی بھوک وافلاس کے کانٹوں سے بھر گئی۔

یہ بات مجھے احمد ندیم قاسمی صاحب نے بتائی ایک مرتبہ استاد دامن پاک و ہند کے مشاعرے کے سلسلے میں دہلی گئے اس مشاعرے میں پنڈت جواہر لال نہرو خاص طور پر استاد دامن کو سننے کے لئے آئے تھے چونکہ یہ دونوں جیلوں میں اکٹھے رہ چکے تھے۔ استاد دامن کے اشعار سن کر پنڈت نہرو رو پڑے اور استاد کے گلے لگ کر کہا۔ "میرا اور میری جنتا کا مطالبہ ہے کہ استاد دامن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھارت میں مقیم ہو جائیں" استاد دامن نے جواب دیا۔ "میں پنڈت جی کی محبت

کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ساتھ ہی یہ اعلان کرتا ہوں میرا وطن پاکستان ہے میں پاکستان ہی میں رہوں گا چاہے ساری عمر جیل میں رہوں۔

ایک روز عید کی صبح میں استاد دامن کے ہاں سلام کے لئے حاضر ہوا استاد کہنے لگے۔ قمر وریش ناشتہ کر لو، میں نے عرض کیا میں کر کے آیا ہوں مگر استاد دامن مجھے پیار سے دوبارہ ناشتہ کرانا چاہتے تھے، میں سمجھ گیا جیسے والے پراٹھے تھے میں چارپائی پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس سے ان کی محبت اور شفقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پچھلے دنوں استاد دامن سخت بیمار ہو گئے تھے اور ان کا گلا بند ہو گیا تھا وہ بولنے سے معذور ہو گئے جب میں ان سے ملا تو ان کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اب خدا کا شکر ہے کہ وہ رو بصحت ہیں۔ مجھے استاد دامن کا یہ شعر کبھی نہیں بھولتا۔

خون رکھ کے جگر دا تلی اُتے دھرتی پوچدے پوچدے گزر چلے
ایتھے کیویں گزاریئے زندگی نوں ایہو سوچدے سوچدے گزر چلے

—◆—

# کرشن چندر

اُس روز موسم بڑا سہانا تھا"

ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں سے کالی گھنگھور گھٹائیں جھومتی ہوئی اٹھیں۔ اور پھر سارے لاہور شہر پر آ کر چھا گئیں تھیں نمدار ٹھنڈی ہوا مستانہ ادا سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لوگوں کے خشک ہونٹوں کو چوم رہی تھی اور لوگوں کے گرمی سے مرجھائے ہوئے چہرے گلاب کے شاداب پھولوں کی طرح کھل گئے تھے۔ پسینہ سوکھ گیا تھا اور جلتی ہوئی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں سرمستیاں فضا میں انگڑائیاں لے رہی تھیں یہ موسم لاہور کے شہریوں کے لئے قدرت کا بیش بہا عطیہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب لوگ خوشی سے سرشار۔ اس دلکش موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے باغ جناح۔ شالامار باغ جہانگیر کے مقبرے اور دریائے راوی پر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ بازاروں میں معمول سے زیادہ گہما گہمی اور شور تھا جیسے سچ مچ جشن بہار ہو۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بچے بوڑھے

سبھی قافلہ در قافلہ آ جا رہے تھے جیسے سمندر کی بے پناہ طوفانی لہریں ساحل سے ٹکرانے کے بعد واپس آ جاتی ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں امنگ اور جوش تھا۔ نوجوان عورتیں کالے برقعے اوڑھے سیاہ گھٹاؤں کی طرح اڑی چلی جا رہی تھیں شام کے چار بجے کے قریب میں اپنے دوستوں کے ساتھ "کیفے ہالہ" میں بیٹھا چائے کی پیالی پر گپ شپ لگا رہا تھا کہ اتنے میں میرے ایک دوست جیب یاد آرٹسٹ نے مجھے اطلاع دی کہ آل انڈیا ریڈیو کی ایک خبر کے مطابق ایشیا کے مایۂ ناز افسانہ نگار... کرشن چندر انتقال فرما گئے ہیں۔ اچانک یہ المناک خبر سن کر میں ششدر رہ گیا جیسے کسی نے میرے کلیجے میں چھرا گھونپ دیا ہو میری آنکھوں میں آنسو کانپنے لگے۔ میں اپنے دوستوں سے معذرت کر کے "کیفے" سے باہر نکل آیا مجھے نہ جانے کیوں اس خبر کے صحیح ہونے کا یقین نہ آ رہا تھا میرا دل یہ نہ مانتا تھا کہ اتنا بڑا حادثہ رونما ہو گیا ہے۔ وہ کرشن چندر جو سینکڑوں زندہ جاوید کہانیوں کا خالق ہے۔ وہ آج موت کے ظالم ہاتھوں سے خود ایک المیہ کہانی کس طرح بن گیا ہے۔ وہ کرشن چندر جس کے خوبصورت ہونٹوں پر ہر وقت ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جس کی باتوں میں گلاب کے پھولوں کی سی خوشبو تھی وہ کرشن چندر جو لاہور کا عاشق تھا۔ لاہور جو حسن خوشبو اور روشنیوں کا شہر ہے جسے بعض لوگ ایشیا کا پیرس بھی کہتے ہیں۔ جہاں مغلیہ دور کی پُرشکوہ عمارتیں ہیں۔ جس کے گلی کوچوں میں "مصور مشرق" چغتائی کے فن کی چلتی پھرتی زندہ تصویریں نظر آتی ہیں شام کو جہاں شاہراہ قائداعظم پر البیلی جوانیوں، حسین چاند جیسے مکھڑوں رشک غزالاں چہروں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے رنگ و نور کا یہ سیلاب جنت نظیر باغ جناح کی طرف اُمنڈتا ہے اور جو یوں تو سارے کا سارا ہی جمالستان ہے۔ لیکن جہاں شام کے وقت انارکلی

میں حسین لوگوں کی بہا بھی۔ بلوہ ساما نی سڑکوں پر حسن و جوانی کے دلکش نظارے کارواں در کارواں رنگ و بو کا خرام دلوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہے اس لاہور کا ایک سچا عاشق کرشن چندر لاہور سے سینکڑوں میل دور لاہور کو دوبارہ دیکھنے کی حسرت اپنے دل میں لئے تڑپتا ہوا مر گیا ہے۔ حالانکہ ان دنوں ... ادبی حلقوں میں کرشن چندر کے لاہور آنے کی خبر خاصی گرم تھی۔ کرشن چندر لاہور آ رہے ہیں وہ مرنے سے قبل لاہور کے دوستوں کو ملنے کے لئے تڑپ رہے ہیں جیسا کہ میں بھی مرنے سے قبل ایک مرتبہ امرتسر شہر کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں میں پیدا ہوا جہاں میری ماں اور آباو اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں اور جہاں مجھے بچپن کے ساتھیوں سے ملنے کی شدید آرزو ہے۔ پھر کرشن چندر نے لاہور آتے ہوئے نہ جانے کیوں اچانک اپنا پروگرام بدل دیا وہ لاہور آنے کی بجائے سیدھا سورگ کی طرف چلے گئے۔ شاید وہ ہماری مذہبی تنگ نظری سے ناراض ہو کر کنّی کاٹ گئے ہوں۔ شاید انہوں نے اپنے دل میں کہا ہو تم اپنا پاسپورٹ اور ویزا اپنے پاس رکھو میں نہیں آتا لاہور میری آنکھوں کے سامنے کرشن چندر کا بچوں کا سا معصوم چہرہ گھوم گیا وہ چاند کی طرح گول مٹول گورا ہنستا مسکراتا ہوا دلآویز مکھڑا ہونٹوں پر ادھ کھلی گلاب کی کلیوں سی مسکراہٹ ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ روزنامہ امروز کے دفتر گیا وہاں، عزیز اثری، قمر تسکین اور رحیم گل بیٹھے ہوئے تھے ان دوستوں کے چہروں پر بھی کرشن چندر کی موت کے صدمے سے حزن و ملال چھایا ہوا تھا قمر تسکین کرشن چندر کے پرانے دوست ہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ کرشن چندر بڑے عظیم انسان تھے

پاکستان بننے سے قبل کرشن چندر لاہور میں موہنی روڈ پر ایک چھوٹی سی سڑک کرشن روڈ پر رہتے تھے جو خود اُن کے نام پر تھی جہاں اُن کا ذاتی مکان تھا ایک روز میں ان سے ملنے کے لئے گیا تو وہ ہاتھ میں دوائی کی ایک خالی شیشی لئے گھر سے باہر نکل رہے تھے میں نے پوچھا کرشن بھائی خیریت تو ہے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ کرشن چندر نے جواب دیا۔ قمر بھائی باقی سب خیریت ہے صرف تمہاری بھابی بیمار ہے۔ میں اس کے لئے دوائی لینے جا رہا ہوں آئیے ہم دونوں اکٹھے چلتے ہیں راستے میں باتیں بھی ہوں گی۔ قمر تسکین نے بتایا کہ ہم دونوں باتیں کرتے کرتے انارکلی آ گئے تو کرشن چندر کہنے لگے آؤ ذرا نگینہ بیکری چلیں دیکھتے ہیں شاید وہاں پر کوئی دوست بیٹھا ہوا مل جائے ہم دونوں نگینہ بیکری میں داخل ہوئے وہاں کرشن چندر کو دیکھتے ہی کئی دوست ان کے گرد شمع کے پروانوں کی طرح جمع ہو گئے تھوڑی دیر میں ادبی بحث چھڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چائے کے کئی دور چلے دو تین دوستوں نے کھانا بھی کھایا جس کا تمام بل کرشن چندر نے ادا کیا۔ دو تین گھنٹے کی نشست کے بعد ہم اُٹھے تو میں نے کہا کرشن جی یہاں آکر تو آپ بھول ہی گئے تھے کہ ہم گھر سے دوائی لینے کے لئے آئے ہیں چلو دوائی تو لے لیں بھابی بیچاری آپ کا راستہ دیکھ رہی ہوگی۔ کرشن چندر نے کہا قمر بھائی اب دوائی کہاں سے آئے گی پندرہ روپے اپنے پاس تھے وہ تو دوستوں کی خاطر مدارت میں اٹھ گئے اب دوائی کل ہی خریدیں گے قمر تسکین نے کہا کرشن چندر بڑے انسان دوست فنکار تھے ہمیشہ ظالموں سے لڑتے تھے اور مظلوموں کی مدد کرتے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے تو وہ بھگت سنگھ کی انقلاب

پسند پارٹی کے باقاعدہ ممبر بھی بنے تھے اور شاہی قلعہ لاہور میں ایک ماہ تک نظر بند بھی رہے بعدازاں وہ لاہور جھاڑوکش یونین کے جنرل سیکرٹری بنے کرشن چندر ہر وقت مسکراتے رہتے تھے ان کو اپنی بڑائی کا کوئی احساس نہ تھا وہ بڑے خوش خلق ملنسار ذہین اور صلح پسند تھے حاضر جوابی اور خوش طبعی اُن کی زندگی کا اہم جزو تھی وہ دوستوں کی محفل میں بے اختیار قہقہوں کے پھول بکھیرتے بغض و کینہ سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ پیار محبت اور عجز و انکساری کا مجسمہ تھے ہر شخص کے بلا امتیاز و ملت خیر خواہ اور مخلص دوست تھے خود تکلیف اور نقصان اٹھا لیتے لیکن دوسروں کو ضرر پہنچانا ان کی طبعیت میں نہ تھا وہ کسی وقت بھی فتنہ و فساد کا باعث نہ بنتے تھے ہر حالت میں دوستی سنبھالنے والے دوست تھے وہ متعصب نہ تھے۔ پاکستان سے ان کا اخلاص ہر شبہ سے بالا تھا۔ میں ان لوگوں کی سوگوار محفل چھوڑ کر انار کلی میں آگیا میں بڑا اداس تھا۔ اگر میرے پاس اس وقت پاسپورٹ اور ویزا ہوتا تو میں یقیناً اسی وقت جہاز پر سوار ہو کر بمبئی پہنچ جاتا اور کرشن چندر کے جنازے میں شریک ہوتا اس کی ارتھی کو کندھا دیتا میں انار کلی کے چوک میں کھڑا تھا۔ میرے آس پاس حسب معمول رنگ و بو کا طوفان امنڈ رہا تھا فضا مختلف خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ مارچ کی آٹھ تاریخ تھی اور بابو لوگوں کو تنخواہ ملنے کی وجہ سے انار کلی پر ایک نیا جوبن آگیا تھا حسین مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ رنگ برنگے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس چلے آ رہے تھے۔ پھولوں کی طرح دلکش جوڑے سجے سنورے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے محو خرام تھے۔ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں تتلیوں کی طرح گھوم پھر رہی تھیں میں اس

رنگ دنُور کے بہتے ہوئے دریا کو دیکھ رہا تھا مچلتی جوانیاں ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی جا رہی تھیں مجھے اس وقت انارکلی عاشق کے خواب کی طرح حسین اور شاعر کے تصور کی طرح رنگین نظر آرہی تھی کھڑے کھڑے میں نے سوچا اب کہاں جاؤں۔ اور کس سے جا کر کہوں کہ آج ایک انقلاب پسند ادیب مر گیا ہے۔ جو ساری عمر غلامی بھوک، افلاس جہالت اور تاریکی کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑتا رہا ہے بالآخر اس جدوجہد میں دل کے ہاتھوں اپنی جان ہار گیا۔

انارکلی میں بے پناہ ہجوم تھا شاذونادر لوگ خرید و فروخت میں مصروف نظر آرہے تھے کسی کو معلوم نہ تھا کہ آج انارکلی کا دوسرا عاشق۔ شہزادہ سلیم یعنی کرشن چندر چلا بسا ہے جس کے قلم کا جادو اور لوہا دوست دشمن سبھی مانتے تھے جو نظم میں نہیں نثر میں شاعری کرتا تھا جس کے ایک جملے میں ایک ایک لفظ پر بھی شعر کی طرح داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ قاری اس کی کہانی پڑھتے وقت جذبات کی رو میں خود بھی ساتھ ہی بہہ جاتا تھا۔ اس کے خیالات کتنے ارفع و اعلیٰ تھے اور الفاظ میں کتنی مقناطیسی کشش تھی اور کتنی مٹھاس اور کتنی رنگین تھی کتنی جذبیت اور کتنا دور رس تھا جیسے وہ کہانی تحریر نہیں بلکہ لفظوں کا حسین تاج محل تعمیر کر رہے ہوں آج کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ رومانی اور انقلابی کہانیوں کا کرشن کینا اپنی گوپیوں یعنی اپنی سندر کہانیوں سے روٹھ کر موت کے گہرے اور تاریک غار میں چلا گیا ہے۔ جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اتنے میں کسی نے چپکے سے آکر میرے گلے میں بازو ڈال دیا میں نے مڑ کر دیکھا تو شاعر انقلاب حبیب جالب کھڑے تھے جو دو لاکھ روپے کی ضمانت پر تازہ تازہ حیدرآباد جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ میں نے جب حبیب جالب

کو کرشن چندر کی وفات کی خبر سنائی تو اس مرد قلندر کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے قطرے مچلنے لگے انہوں نے بتایا کہ وہ جب پاک بھارت مشاعرہ کے سلسلے میں بھارت گئے تھے تو وہاں کرشن چندر نے ان کی دعوت کی تھی انہوں نے بتایا کہ وہ لاہور کا ذکر بڑی حسرت سے کرتے تھے جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ اب کبھی بھی اپنے پیارے شہر لاہور کو نہ دیکھ سکیں گے میں حبیب جالب سے اجازت لے کر دفتر ماہنامہ فنون پہنچا وہاں احمد ندیمؔ قاسمی تشریف فرما تھے اور ان کے آس پاس کئی ادب نواز دوست بیٹھے ہوئے تھے میں نے احمد ندیم قاسمی کو کرشن چندر کی وفات کی خبر سنائی تو انہوں نے بتایا کہ انہیں اس خبر کا پہلے ہی پتہ لگ چکا ہے احمد ندیم قاسمی کہہ رہے تھے کہ کرشن چندر اس صدی کے بہت بڑے فنکار ہی نہیں بلکہ بڑے عظیم انسان بھی تھے سعادت حسن منٹو مرحوم اکثر کرشن چندر سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ "یار اس کرشن چندر کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ بندۂ خدا ہر ایک آدمی کو کیوں خوش کرنا چاہتا ہے یہ بھولا بھالا شخص اتنا بھی نہیں جانتا کہ ہر آدمی کو خوش خدا تو کیا شیطان بھی نہیں رکھ سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ یہ کرشن چندر سب کو کیسے خوش کر سکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی بتا رہے تھے کہ اگر کوئی شخص کرشن چندر کے سامنے ان کی کسی کہانی کی تعریف کرتا تو وہ بجائے خوشی سے پھول کر کپا ہو نے کے شرما جاتے تھے۔ یا بات کا رُخ کسی اور طرف بدل دیتے تھے۔ قاسمی صاحب کے آس پاس بیٹھے ہوئے ان کے عقیدت مند بھی کرشن چندر کی وفات پر اظہار افسوس کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ کرشن چندر بھارت سے زیادہ پاکستان میں مقبول ہیں اور اس کی دو

وجوہات تھیں ایک وجہ تو یہ کہ وہ مذہب سے بلند ہو کر عوامی نکتۂ نظر سے لکھتے تھے دوسری وجہ یہ کہ جس زبان کے وہ ادیب تھے وہ زبان مہاجر ہو کر پاکستان چلی آئی تھی۔ اگرچہ وہ زبان بھارت میں بھی تھی لیکن ڈری ڈری اور سہمی ہوئی تھی میں وہ محفل چھوڑ کر لوہاری گیٹ سے باہر اومنی بس اسٹاپ پر آ گیا وہاں سے اپنے دوست سہراب اسلم ایڈووکیٹ کو ملنے کے لئے شاہدرہ ٹاؤن روانہ ہو گیا۔ بس میں بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا میں نے اپنے دوست سہراب اسلم سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ کرشن چندر لاہور دیکھنے کے لئے بہت تڑپتے ہیں جب بھی کوئی پاکستانی کرشن چندر سے بمبئی ملنے جاتا ہے تو کرشن چندر اس سے لاہور کی باتیں کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کیا اب بھی انار کلی بازار میں ویسی ہی پر رونق شام ہوتی ہے کیا اب بھی مال روڈ پر پری چہرہ حسینوں کے جھرمٹ ہوتے ہیں۔ لارنس باغ شالامار باغ جہانگیر کے مقبرے اور دریائے راوی کے کنارے پر اسی طرح زندہ دلان لاہور بے فکری سے اودھم مچاتے ہیں؟ کیا اب بھی وہاں پر پہلے کی سی چہل پہل ہے۔ شالامار باغ میں مادھو لال حسین کے مزار پر میلہ چراغاں لگتا ہے؟ سہراب اسلم نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا کہ جب بھی پاک بھارت کے تعلقات ٹھیک ہوئے تو میں کرشن چندر کو لاہور آنے کی دعوت دوں گا مگر پاک بھارت حالات آئے دن کسی بے وفا معشوق کی طرح بگڑتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اومنی بس اڑتی چلی جا رہی تھی میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا نہ جانے کہاں نکل گیا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا راوی کے پار سورج سیاہ بادلوں کے لحاف میں سے جھانک رہا تھا اور ہوا بادلوں کے ٹکڑوں کو اڑاتے لئے چلی جا رہی تھی۔ دریائے راوی آیا اور گزر گیا دو چار موڑ مڑنے کے بعد اومنی بس سے اتر کر

سہراب اسلم کے ساتھ کرشن چندر کی وفات کا اظہار افسوس کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں مگر وہ ازلی ابدی خانہ بدوش گھر سے غائب تھا۔ میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دریائے راوی کے کنارے اس مخصوص اونچے پتھروں کی تکون پر جا کر بیٹھ گیا جو اہرام مصر کی طرح بنی ہوئی ہے اور جہاں میں اور سہراب اسلم اکثر بیٹھا کرتے تھے آس پاس شیشم کیکر اور شہتوت کے پیڑوں کا ذخیرہ تھا۔ وہاں پر تنہائی میں بیٹھ کر ہم ادب اور فن پر لمبی چوڑی بحث کیا کرتے تھے اب آسمان غلیظ بادلوں سے سلیٹ کی طرح صاف ہو رہا تھا مگر کہیں کہیں اب بھی بادلوں کے تلنگے آوارہ بھٹک رہے تھے سہراب اسلم کے نہ ملنے سے میں اور بھی اداس ہو گیا شام کا سورج دریائے راوی کے خاکستری سینے میں اپنی شعاعوں کے تیر چھوڑ رہا تھا۔ روشنی کا ایک شعلہ پار سیلاب امڈ آیا تھا آسمان کی نیلاہٹ پھیکی پڑ گئی تھی۔ افق پر غبار سا چھا گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دریائے راوی کا پانی بہتے بہتے سو گیا ہے۔ اب اتنی ہوا نہ تھی کہ دریا کی خوبصورت پیشانی شکن آلود ہو جائے دریا کے کنارے گہرا سکوت چھایا ہوا تھا میں اس بھیانک خاموشی میں حسرت سے دور بہت دور تک پانی کو دیکھتا رہا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساری دنیا شگفتگی سے بالکل محروم ہو چکی ہے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ راوی میں آسمان کا عکس جھول رہا ہے یا آسمان پر راوی کا پرتو ہے دریا کا منظر ہر لمحہ بدل رہا تھا لیکن ہر طرف ویرانی اور سردی کی حکمرانی تھی میرے دل میں بار بار کرشن چندر کا خیال آ رہا تھا جو آگ اور خون کے طوفان کے سامنے ڈٹا رہا ۱۹۴۷ میں جب کہ پانچ دریاؤں کی سرزمین پہ جیسا خون کا چھینٹا دریا بہہ رہا تھا اس زمانے میں بڑے بڑے انسان دوست ادیب بھی مذہبی پاگل پن کا شکار ہو کر قتل و غارت کی تعلیم دے رہے

بڑے بڑے زاہدوں پرہیز گاروں نے اپنے عماموں اور جبوں کی کمندیں بنائی اور بڑے بڑے گیانیوں مہاپرشں پنڈتوں نے اپنی مالاؤں کے جال اور بڑے بڑے پیروں، گدی نشینوں اور ملاؤں نے اپنی تسبیحوں سے پھندوں کا کام لیا اور خدا بھگوان اور گورو کے مقدس نام پر انسانوں کو قتل و غارت کی تعلیم دی اور بے گناہ معصوم بچوں بوڑھوں نوجوان عورتوں کو تہہ تیغ کروایا پنجاب کی دھرتی لہولہان کرایا انسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ لگا کر پرامن بستیاں جلا کر انسانوں سمیت راکھ کر دی گئیں اس وقت کرشن چندر ہی تھے جو اس قتل و غارت کے خلاف اپنا فولادی قلم لے کر میدان میں نکلے تھے وہ فرقہ پرست متعصب نہ تھے بلکہ فراخ دل تھے اُن کے خیالات پاکیزہ تھے۔ وہ روشن ضمیر تھے وہ جھوٹے مذہب کے باغی تھے۔ انسانیت کے پرستار تھے سرمایہ داری جاگیرداری نوکرشاہی سامراجی لٹیروں کے سخت دشمن تھے وہ کسانوں مزدوروں کے حامی تھے کرشن چندر کبھی نہیں مر سکتے۔ میرا خیال ہے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے جب تک اس کے دوست زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان زندہ رہے گی۔ کوئی ایٹم کوئی ہائیڈروجن بم اسے نہیں مار سکتا اس کی اس کی لافانی کہانیاں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ وہ کبھی نہیں مر سکیں۔ میرا دل یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ کرشن چندر جیسے مخلص ہمدرد۔ غمگسار دوست جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے جو خود ننگے رہ کر دوسروں کو اپنے کپڑے پہنا دیتے تھے اپنے لاکھوں چاہنے والوں سے کیسے منہ موڑ کر اور روٹھ کر جا سکتے ہیں انسانیت غیر فانی ہے نیک انسان کبھی نہیں

مرتے وہ کیسے مر سکتے ہیں جو دُکھی دلوں کا سہارا ہوں جو دلکش اور حسن سے بھرپور کہانیوں سے افسردہ دلوں کو خوشی کی روشنی دیتے تھے سہانے خواب دکھاتے تھے مجھے کرشن چندر اندھیرے سماج میں روشنی کے مینار کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو اس خود غرضی کے دور میں منزل کا پتہ دیتا ہے ........

موسم بہار کی شام تھی قدرت نے اپنے خزانے چاروں طرف دلفریب مناظر کی صورت بکھیر دیئے تھے میں وہاں سے اٹھ کر راوی کے دوسرے کنارے پر چلا گیا وہاں پر بہار اور شادابی کی جلوہ نمایاں عروج پر تھیں چھوٹے سے چمنستان میں رنگا رنگ پھولوں کی نزاہت آرائیاں تھیں پرندوں کی دلکش اور میٹھی میٹھی آواز میں نغمہ سرائیاں تھیں اٹھکیلیاں تھیں جذبات انگیز کیفیات کی طوفان خیزیاں تھیں غرضیکہ کائنات میں نئی زندگی کی نئی ترنگ شگفتگی شادمانی بالیدگی کا حشر برپا تھا آڑوؤں کے گلابی پھولوں والی ٹہنیاں نوجوان کنواری دوشیزاؤں کا روپ دھار کر ہوا میں مستی سے جھوم رہی تھیں میرے دیکھتے دیکھتے وہاں نوجوان مردوں عورتوں اور بچوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا گلبدن پری چہرہ حسین لڑکیاں یوں بن سج دھج کر آئی تھیں جیسے کسی مقابلہ حسن میں شرکت کرنے آئی ہوں راوی کی آغوش میں جوان مخمور بہکے ہوئے جسم ابر آلود شام میں قہقہوں کی گلکاریاں مچلتی ہوئی کھلکھلاتی فلمی ستاروں کی طرح حسینوں کے جھرمٹ ان کی آنکھ مچولیاں کسی کے روٹھنے کی ادا۔ کسی کے مچلنے کی ادا۔ کسی کا کسی سے آنکھ ملانا۔ کسی کا آنکھ چرانا سنگ مرمر کی طرح سپید اور کندن جیسے جسموں کی دمک مخمور سانسوں کی مہک۔ کبھی شوخ کبھی خرام آہوں

کی مستی رقص۔ میں نے دیکھا ان حسینوں میں محبت کا دیوتا کیوپڈ کا تیر کمان لئے گھات میں تھا کہ کوئی وہ معصوم دل مل جائیں تو انہیں اپنے بے خطا تیر کا نشانہ بنا کر سوز الفت میں تڑپتا دیکھے وہ اپنے کندھے پر نیلے نیلے پھولوں کی نازک کمان ڈالے ہوئے تھا آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی لبوں پر تبسم ناچ رہا تھا دنیائے جذبات میں ہلچل مچا دینے والی اداؤں کے اثرات سے فضا کو مخمور کر رہا تھا۔ میں نے راوی کے سپاٹ سینے پر نظر ڈالی تو مجھے دور ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی کشتی آہستہ آہستہ مٹیالی لہروں پر تیرتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ سورج ڈوبتے ہوئے انگارے کی طرح دریائے راوی کے سینے پر عکس ڈال رہا تھا یہ سورج مجھے کسی بوڑھے تھکے ہارے مسافر کی طرح کانپتا ہوا دکھائی دے رہا تھا سورج نے ہر شے پر سنہری کرنوں کی ایک طلائی چادر سی بچھا دی تھی ہر شے کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی تھی آہستہ آہستہ پھر بادل گھرنے ہونے لگے اور خنکی بڑھنے لگی۔ ہوا ہولے ہولے چلنے لگی سفید سفید بگلے بھی لمبی قطاریں بنا کر دریائے راوی پر اڑنے لگے کبھی ساحل کی طرف کبھی دور دور پانی کی سطح پر پھر ساری فضا جیسے کچی نیند کے بعد کھلائی آنکھوں کی طرح ہو گئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے حسین الھڑ کنواریاں حسین مردوں پر تبسم کی بجلیاں گراتی شوخ تتلیوں کی طرح ناچتی کچھ تو بیاہتا محو خرام ہنسی کے نقرئی پھول لٹاتی کاروں رکشوں۔ سکوٹروں پر سوار ہو کر چلی گئیں۔ میں راوی کے کنارے اکیلا رہ گیا سامنے لہلہاتے کھیتوں کا نظارہ مسحور کن تھا۔ شام اپنے ساتھ خوابوں کی کہکشاں اوڑھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے سانولی سلونی شام نے اپنا سرمئی آنچل رات کی سیاہی میں بھگو دیا۔ طوطوں کا ایک غول آسمان پہ ڈار کی شکل میں پرواز کر رہا

تھا رات کے سیاہ گیسو آکاش کی وسعتوں سے اتر کر زمین کو چھونے لگے۔ یادوں کے قافلے بھی آوارہ گردی کر رہے تھے۔ تیز ہوا کے ٹھنڈے خوشگوار جھونکے جسم کے آر پار ہونے لگے تو میں دوبارہ اومنی بس میں بیٹھ کر شاہ زرہ ٹاؤن سے لوہاری گیٹ واپس چلا آیا اور پھر چوک متی کے اندر کوچہ پیر شیرازی میں گذرا تھا وہاں ان کے رشتہ دار رہتے تھے انہوں نے کوچہ پیر شیرازی کے عنوان سے ایک بڑی خوبصورت کہانی لکھی تھی۔ وہ کہانی میں نے اس کی کتاب "ہم وحشی ہیں" میں پڑھی ہے وہ کہانی بڑی دلنواز ہے۔ اس گلی کے ساتھ والی گلی میں آج کل میری بھتیجی فرزانہ محمود رہتی ہے میں اس کے گھر چلا گیا میری بھتیجی نے میرا اداس بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا "چچا جان مجھے پتہ ہے آج آپ دو سال کے بعد میرے پاس کیوں آئے ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا "بتاؤ میں کیوں آیا ہوں" اس نے کہا آپ میرے پاس کرشن چندر کی وفات پر اظہار افسوس کرنے آئے ہیں۔ میں نے اس کے منہ سے اپنے دل کی بات سن کر اور اس کے منہ سے اپنے دل کی بات سن کر اور اس کی قیافہ شناسی پر حیران ہوتے ہوئے کہا "یہ بات تو ٹھیک ہے۔ میں آیا تو اسی مقصد کے لئے ہوں لیکن ساتھ ہی میں تمہارے ٹیلی ویژن پر یہ دیکھنے کے لئے بھی آیا ہوں شاید آج امرتسر ٹیلی ویژن سے کرشن چندر کی وفات پر کوئی دستاویزی رپورٹ پیش کی جائے۔ میری بھتیجی نے بتایا وہ تو کل شام کو ٹیلی ویژن پر کرشن چندر کا انٹرویو دکھا چکے ہیں۔ میں یہ سن کر اور بھی اداس ہو گیا میں اور میری بھتیجی کافی دیر تک امرتسر ٹی وی لگا کر انتظار کرتے اور کرشن چندر کی ادبی خدمات اور انسان دوستی کی باتیں کرتے رہے۔ میری بھتیجی بھی۔ میری طرح۔ کوئی خاص پڑھی لکھی نہیں مگر مجھے یہ

جان کر خوشی ہوئی کہ وہ بھی میری طرح کرشن چندر کی کہانیوں کی شیدائی ہے اور اس نے بھی کافی تعداد میں کرشن چندر کی کتابیں پڑھی ہیں اور وہ بھی اس ترقی پسند فنکار سے بہت متاثر ہے کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں وہاں سے اپنے گھر چلا آیا رات کافی بیت چکی تھی آسمان پر سیاہ بادل چپ چاپ زمین کو گھورتے ہوئے دکھائی دیتے تھے بجلی کڑکنے لگی بادل گرجنے لگے ہواؤں نے ماتمی راگ گانا شروع کر دیا پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کائنات بھی میرے ساتھ کرشن چندر کی موت کے غم میں برابر کی شریک ہے۔ میں کچھ کھاتے پیتے بغیر بستر پر لیٹ کر کرشن چندر کے بارے میں سوچنے لگا وہ اردو زبان کو اپنی زبان کہتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اردو ہماری زبان ہے ہماری دھرتی نے اسے جنم دیا ہے یہ باہر کسی دوسرے ملک سے نہیں آئی اس پر کسی ایک فرقے کی چھاپ نہیں ہے وہ ہندو مسلم فساد کے خلاف اور اتحاد کے حامی تھے۔ آگ کے اگلتے لمحوں میں مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر ہر شخص کے غم گسار تھے۔ دنیا میں جہاں کہیں ظلم و تشدد ہوتا وہ اس کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ وہ جنگ کے دشمن اور امن کے حامی تھے۔ وہ پاک بھارت کی دوستی اور امن چاہتے تھے وہ دونوں ملکوں کے کھیتوں پر ٹینکوں کی بجائے ٹریکٹر چلتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے جو شخص ہاتھ میں پھول پکڑ کر بھی لڑتے ہوئے دکھائی دے گا وہ بڑا احمق نظر آئے گا وہ فلمی اور سیاسی حلقوں میں بھی کافی مقبول تھے پاک بھارت فلم انڈسٹری کی ممتاز شخصیتیں ان کی مداح تھیں کرشن چندر کی وفات سے ادب کا آفتاب غروب ہو گیا اردو ادب کا ایک عظیم الشان باب ختم ہوا انسان دوستی خلوص و مروت

کی مناجات پڑھنے والے لب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ کرشن چندر کی مختصر زندگی کا اشک سفر ختم ہو گیا۔ سچائی کا ترجمان محبت کی داستان سنانے والا چلا گیا کرشن چندر کی موت کے غم میں ہوا کے لب پر جدائی کا نوحہ ہے آسمان بھی سیاہ پوش ہو کر ہولے ہولے رو رہا ہے آج لاہور کا عاشق دریائے راوی سے سینکڑوں میل دور بمبئی کے سمندر کے کنارے ایک ارتھی کی صورت میں جل رہا ہے۔ جب وہ زندہ تھے تو تمام عمر دوسروں کی آگ میں جلتے تھے مگر آج وہ خود اپنی آگ میں جل رہے ہیں۔ میرے سینے میں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے آگ لگا دی ہو یہ آگ کرشن چندر کی جدائی کی آگ تھی میرے آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر بہہ نکلے گرم گرم نمکین آنسو جو میری آنکھوں کو جھلسا رہے تھے شاید یہ پاگل آنسو میرے سینے میں کرشن چندر کی جدائی میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے نکلے تھے۔

# احمد ندیم قاسمی

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے راقم ریلوے لوکو ورکشاپ میں بطور مزدور ملازم تھا اور ساتھ ہی مرزا محمد ابراہیم کی ریلوے ورکرز یونین میں مزدوروں کی بہتری کے لئے کام بھی کرتا تھا اُن دنوں لوکو اور کیرج ورکشاپ کے درمیان میدان میں ہر دوسرے تیسرے دن مزدوروں کے جلسے منعقد ہوتے تھے جن میں راقم بھی بڑی باقاعدگی سے حصہ لیتا تھا۔ ان جلسوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے احمد ندیم قاسمی۔ ظہیر کاشمیری۔ احمد راہی۔ عارف عبدالمتین۔ اور عبداللہ ملک شرکت کرنے آتے تھے۔ اور محنت کشوں کو اُن کی جدوجہد میں اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلاتے تھے" ان سب دانشوروں میں مجھے جو سب سے زیادہ پُرکشش شخصیت نظر آئی وہ قاسمی صاحب کی تھی ان تمام فنکار دوستوں کے درمیان وہ ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے چمکتے دمکتے ہوئے پُرنور حسین ستاروں کی کہکشاں

کے جھرمٹ میں اکیلا چاند" جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت سی مُسکراہٹ کھیل رہی تھی (یہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دلکش مسکراہٹ ہر وقت ان کے لبوں پہ کھیلتی رہتی ہے) میں اس جیالے فنکار کو دُور سے ایسے دیکھتا جیسے کوئی اچھوت کسی مندر کے دیوتا کو حسرت سے دیکھتا ہے لیکن جسے اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں ہوتی اس کے برعکس احمد ندیم قاسمی کے قریب جانے پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن چونکہ وہ صاف شفاف سادہ لباس میں ملبوس ہوتے تھے اور میں اُن دنوں میلا کچیلا ہونے کی وجہ سے ایک طرح کمتری کا شکار تھا اس وقت میرا حلیہ مبارک کچھ اس قسم کا تھا کہ پھٹا پرانا قمیض پاجامہ وہ بھی میلا چیکٹ اس پر لاتعداد تیل اور سیاہی کے دھبے اور اوپر سے پیوندوں کی میناکاری! سر پہ بغیر تیل کے بکھرے ہوئے گردآلود بال بڑھی ہوئی شیو۔ پاؤں میں ہلکی پھلکی ٹوٹی ہوئی چپل دراصل یہی پوزیشن مجھے اُن کے کے قریب جانے سے روکتی تھی۔ اور ساتھ ہی میں سوچتا تھا کہ آیا اُن سے کوئی بات بھی کر سکوں گا یا نہیں؟ کہیں ان کے سامنے اس احساس کمتری سے بوکھلا کر ہکلانے ہی نہ لگ جاؤں کہیں شدت جذبات یا بے پناہ خوشی سے میرے گلے میں پھندہ ہی نہ پڑ جائے۔ غرض ان دنوں میں قاسمی صاحب سے بات کرنے کو ترستا تھا آخر ایک دن میری ان سے لوکو کیرج ورکشاپ کے درمیان مزدوروں کے عظیم الشان جلسہ عام میں ملاقات ہو گئی میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا کیونکہ وہ بہت سادہ انسان نکلے۔ انسان کو جاننے اور سمجھنے کے لیے کسی طویل عرصہ کی ضرورت نہیں ہوتی "وہ انسان جسے ہم بار بار ملنے کے بعد نہیں پہچانتے" وہ یقیناً بہت پیچیدہ شخصیت ہوتی ہے، لیکن قاسمی صاحب مجھے نہایت سیدھے سادے انسان

دکھائی دیئے" اُن کا کوئی پہلو بھی پیچیدہ نہ تھا اُن کا ظاہر باطن ایک تھا اور ایسی راست باز شخصیت تو ایک آدھ ملاقات میں ہی پہچانی جاتی ہے اس کے بعد مجھے ان گنت ملاقاتیں اور باتیں کرنے کا موقع ملا لیکن میرے ذہن میں اُن کی پہلی ملاقات کا تاثر محفوظ رہا اُن کی شخصیت پر ایک عظیم فنکار اور اچھے انسان کی گہری چھاپ تھی وہ ایک ایسے نیک دل اور سادہ لوح انسان ہیں کہ بے اختیار ان کی دلکش شخصیت پر پیار آجاتا ہے، اور ہر ملاقات کے بعد اور زیادہ محبت ہمدردی اور اپنائیت محسوس ہوتی ہے میں اُن کو بڑا مالدار انسان سمجھتا تھا، حالانکہ نہ اُن کے پاس کوٹھی تھی، نہ کار نہ بینک بیلنس، وہ ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے، اس مکان میں اعلیٰ قسم کا فرنیچر بھی نہ تھا۔ ان کے پاس نفیس اور شاندار ملبوسات بھی نہ تھے" زندگی کی یہ آسائشیں انہیں محض اس لئے میسر نہ تھیں، کہ وہ عظیم فنکار اور سچے انسان تھے ان کا دل ہر کسی کے لئے محبت ہمدردی اور شرافت سے معمور تھا۔ وہ چند لوگوں کی قلبی تسکین اور مسرت کی خاطر اپنی جیب کی آخری پائی بھی دوسروں پر خرچ کر دیتے تھے، یہی اُن کی زندگی کا سنہری اصول تھا۔ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو بے چین ہو جاتے اور دوسروں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہ کرتے ایسے موقعوں پر اُن کی آنکھوں میں چمک بڑھ جاتی ہونٹوں کی مسکراہٹ اور زیادہ دلآویز ہو جاتی۔ میں نے دیکھا کہ ان دنوں عام طور پر ان کی مالی حالت خراب رہتی تھی۔ قاسمی صاحب نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور میرے خیالات کو سراہا اس دوران میرے اُن سے روابط بڑھتے ہی گئے جس کی وجہ سے میں انہیں بہت قریب سے جاننے لگا" وہ غریب آدمی ہونے کے باوجود نہایت راست گو انسان ہیں" فن اخلاق اور انسانی خوبیوں اور قدروں سے نہیں بلکہ مساوی دولت

سے محروم ہیں کیونکہ یہ دولت ان کی نظروں میں بہت حقیر تھی وہ پیسے کو زندگی کا حاصل نہیں سمجھتے بلکہ اپنے فن اور انسانیت کو اولیت اور اہمیت دیتے ہیں اسی لئے آج جہاں تک فنی عظمتوں کا تعلق ہے۔ کوئی اُن کا ثانی نہیں ان کی آواز بہت جاندار ہے لیکن اس میں تلخی یا کرختگی نہیں نرمی اور شیرینی ہے اُن کا لہجہ خود اعتمادی کا مظہر ہے اُن کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے" اُن میں محبت کی چاشنی ہوتی ہے یہ سچائی اور محبت دلوں پر ثبت ہو جاتی ہے اور ایک نہ مٹنے والی چھاپ چھوڑ جاتی ہے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ان کی پہلی ملاقات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ پھر میری اُن سے مزدوروں کے جلسوں اور جلوسوں میں اَن گنت ملاقاتیں ہوئیں اور آہستہ آہستہ میرے دل سے احساس کمتری دور ہو تا گیا میں کسی ڈر اور جھجک کے بغیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بھی شریک ہونے لگا یہ زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے شباب کا نہیں بلکہ " عتاب شاہی کا بھی تھا اُن دنوں بڑا مزا آتا۔ ترقی پسند ادیبوں اور پولیس کے درمیان آنکھ مچولی کھیلی جاتی تھی۔ جہاں ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہوتا تھا وہاں خفیہ پولیس پہلے ہی پہنچ جاتی تھی" اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پولیس جرائم پیشہ لوگوں کو چھوڑ کر ترقی پسند ادیبوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے ترقی پسند ادیب سرکس کے مداریوں کی طرح جگہ بدل بدل کر جلسے کرتے تھے" کسی شاعر نے کرسی اٹھائی ہوتی تھی کسی افسانہ نگار نے میز اور کسی نقاد نے انجمن کا رجسٹر بغل میں دبایا ہوتا تھا" اور مخالف لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے تھے" لو جی یہ ازلی ابدی خانہ بدوش یعنی ترقی پسند ادیب جا رہے ہیں ان دنوں ترقی پسند ادیبوں کو نوکریوں سے نکالا جاتا تھا" خفیہ پولیس ان کا دس

نمبری بدمعاشوں کی طرح پیچھا کرتی تھی انہیں تھانوں میں بلا کر تشدد کا شکار اور تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا تھا" ترقی پسند ادیبوں سے نئی نئی دوستی ہوئی تھی یہ زمانہ دوستی کی آزمائش کا تھا بڑے بڑے قلمکار یا تو پولیس سے ڈر گئے تھے یا سرمایہ کے ہاتھوں بک گئے تھے اور عوام سے کٹ کر حکومت کی گود میں بیٹھ گئے تھے، قاسمی صاحب نے اس پُر تشدد دور میں محنت کشوں کا عملی ساتھ دیا اور مزدوروں کی عظمت کے گیت گاتے ہوئے جیل بھی گئے میری یہ واقفیت دوستی کے زمانہ گزرتا گیا اور رشتے میں بدل گئی لیکن دوستی کے رشتے کے ساتھ ساتھ میں انہیں ہمیشہ ادب واحترام کی نظروں سے دیکھتا ہوں کیونکہ انہوں نے اپنے تخیل کی رفعت سے اردو کے فن افسانہ نگاری کو عروج پر پہنچایا اور اس طرح اردو ادب میں خوبصورت اور لازوال افسانوں کا اضافہ کیا ہے۔ وہ میرے رہنما ہیں انہوں نے اپنے حوصلے ذہانت اور فن کی بلندیوں کا سفر طے کر کے دل پر جا لیا ہے۔ دل سے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ میری سوچ سے زیادہ بلند ہیں۔ میری ان کی دوستی تیس سال پرانی ہے۔ ایک شخص کو جاننے کے لئے یہ بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے میرا خیال ہے اس دنیا میں کسی نے اچھا انسان دیکھنا ہو یا عزم اور حوصلے صبر وضبط ہمدردی انکساری مروّت اخلاق اور اخلاص کی زندہ تصویر دیکھنی ہو تو وہ احمد ندیم قاسمی کو دیکھے سینکڑوں فنکاروں میں سے جب میں کسی ایک مکمل انسان کے بارے میں سوچتا ہوں تو بے اختیار احمد ندیم قاسمی کا تصور میرے سامنے آجاتا ہے ایک دفعہ کا ذکر ہے، میں نے اپنے دوست سردار محمد ابراہیم خان سابق صدر حکومت آزاد کشمیر سے پوچھا کیا آپ بھی کبھی احمد ندیم قاسمی سے ملیں ہیں تو انہوں نے جواب دیا ابھی اُن سے میرا تعارف

نہیں ہوا گو میں ان کے خوبصورت افسانے پڑھ چکا ہوں وہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا وہ نہ صرف ملک کے مایہ ناز فنکار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان ہیں ان سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہو گی سردار محمد ابراہیم خان نے احمد ندیم قاسمی سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا راقم نے شاہراہ قائداعظم پر واقعہ انڈس ہوٹل میں ان دونوں کی ملاقات کا بندوبست کیا سردار صاحب نے کہا اگر ایک دو اور بھی دوست ہو جائیں تو اچھا ہے راقم نے احمد ندیم قاسمی کے ساتھ استاد ڈاکٹر فضل الہی قربان کو بھی دعوت دے دی اور خود وقت مقررہ پر انڈس ہوٹل پہنچ گیا۔ ان دنوں جمہوریت کے لئے طلبا تحریک چلا رہے تھے پورا شاہراہ قائداعظم پر سخت خونی ہنگامے ہو رہے تھے پولیس لاٹھی چارج آنسو لانے والی گیس اور گولی کا فراخ دلانہ استعمال کر رہی تھی میں انڈس ہوٹل کے باہر گیٹ پر کھڑا تھا" آنسو گیس سے متاثرہ آنکھوں سے آنسو پونچھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا جب پولیس طلباء کا پیچھا کرتی ہوئی انڈس ہوٹل کے قریب آتی تو میں بھاگ کر انڈس ہوٹل کے اندر گھس جاتا میرے مہمانوں کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا ایک خیال آتا کہ میں جان بچا کر اپنے گھر چلا جاؤں اس ہنگامہ دار و گیر میں کون آئے گا؟ - پھر دوسرا خیال آیا کہ یہی آزمائش کا وقت اور دوستی کا امتحان ہے بھاگتے کیوں ہو؟ حوصلہ رکھو اگر وہ آ گئے تو کیا کہیں گے۔۔!! کہ قمر لودھی لاٹھی چارج آنسو گیس اور گولی کے ڈر سے بھاگ گیا اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سردار صاحب آ گئے ہیں انہوں نے آتے ہی کہا یار بہت گڑبڑ ہو رہی ہے ساری شاہراہ قائداعظم خونی ہنگاموں کی لپیٹ میں ہے پولیس اور طلباء کی آپس میں آنکھ مچولی ہو رہی ہے۔ میری بیوی

مجھے منع کر رہی تھی کہ شاید قائد اعظم پہ گولی چل رہی ہے آپ یہ دعوت منسوخ کر دیں اور وہاں نہ جائیں لیکن میں نے کہا کہ قمر یورش سے وعدہ کیا ہے اور اس نے آگے احمد ندیم قاسمی سے وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ میں کیسے رک جاؤں" پھر سردار صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کوئی آیا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا آپ چل کر اندر تشریف رکھیں ابھی سب دوست ضرور آئیں گے۔۔۔ نو بجے تک دوست آگئے۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک رکشا سے استاد دامن اترے تو ایک ٹیکسی سے احمد ندیم قاسمی باہر نکلے اور جب میری نظر سامنے پڑی تو فضل الٰہی قربان بغل میں اپنا چرمی تھیلا دبائے چلے آ رہے ہیں۔ سب دوست اکٹھے ہو گئے تو میری جان میں جان آئی میں نے اپنے دل میں خدا کا شکر ادا کیا چنانچہ میں نے احمد ندیم قاسمی استاد دامن اور فضل الٰہی قربان کا سردار محمد ابراہیم خان سے تعارف کرایا سردار صاحب ان سب سے مل کر بہت خوش ہوئے مگر یہ محفل اس لیے نہ جم سکی کہ ہوٹل کے باہر طلبا کے جلوس بدستور ہنگامے ہو رہے تھے ہم نے پولیس کے رویے پر اظہار افسوس کیا کہ ناحق وہ طلبا کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے اور جلد ہی یہ محفل یاراں برخاست ہو گئی اور اس طرح مجھے علم ہو گیا کہ احمد ندیم قاسمی جس سے وعدہ کرتے ہیں ضرور پورا کرتے ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا کہ کئی لوگ احمد ندیم قاسمی کے پاس اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھوانے کے لیے آتے ہیں اور ان کی منت سماجت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر آپ دیباچہ نہیں لکھتے تو کم از کم ڈسٹ کور پر دو چار حروف ہی تبرکاً لکھ دیں لیکن قاسمی صاحب اگر کسی کتاب کو اس قابل سمجھتے تو بلا تامل اس پر لکھ دیتے اگر کتاب اس قابل نہ ہوتی تو صاف انکار کر دیتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے فنون کے

دفتر میں ملتان سے ایک شخص آیا اور آ کر کہا جناب قاسمی صاحب مجھے فلاں شاعر نے بھیجا ہے آپ ان کی کتاب پر دیباچہ لکھ دیں قاسمی صاحب نے نا صرف اس شاعر کی کتاب پر دیباچہ لکھنے سے انکار کیا۔ بلکہ اُسے تنبیہہ کی اور کہا کہ آپ میری طرف سے انہیں کہہ دیں کہ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ خود محنت کرے اسی طرح اگر کوئی بڑے سے بڑا سرکاری آفیسر بھی ان سے اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنے کے لئے کہتا تو وہ کتاب معیاری نہ ہونے کی صورت میں صاف انکار کر دیتے اور کوئی لگی لپٹی نہ رکھتے ایک دن میرے سامنے ایک بہت بڑے سرکاری آفیسر شاعر کی کتاب آپ کے پاس دیباچہ لکھنے کے لئے آئی تو آپ نے صاف انکار کر دیا۔ ایک شخص نے جب زور دیا تو آپ نے بڑی نرمی سے کہا اگر آپ مجھے اس کتاب پر دیباچہ لکھنے کے لئے زیادہ مجبور کریں گے تو میں کتاب پھاڑ کر گندی نالی میں پھینک دوں گا اس پر فرمائش کرنے والا شرمندہ ہو گیا۔ میں نے جسارت کی "قاسمی صاحب آپ نے کتاب پر دیباچہ کیوں نہیں لکھا؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ ایک بہت بڑا سرکاری آفیسر ہے" قاسمی صاحب نے مسکرا کر کہا "یہ بات نہیں۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ شاعر جناتی قسم کی زبان میں شاعری کرتا ہے۔ نہ اس کی شاعری عوام کے پلے پڑتی ہے نہ خواص کے۔ ایسی شاعری کرنے سے کیا فائدہ جو دل کو نہ چھوئے؟ میں نے ہمیشہ قاسمی صاحب کی آنکھوں میں غور و فکر۔ ذہانت۔ سچائی۔ شوخی اور ایمانداری کی چمک دیکھی ہے وہ کسی بھی کیفیت سے گزر رہے ہوں یہ کیفیت ہمیشہ رہتی ہے ذاتی طور پر قاسمی صاحب نے جس قدر میری حوصلہ افزائی کی ہے شاید ہی کسی اور کی کی ہو۔ اس کے لئے میں ان کا بہت شکر گزار ہوں ایک دن میں نے کہا قاسمی صاحب آپ نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے میں مرتے دم تک آپ

کا یہ احسان نہیں بھولونگا کہنے لگے دیکھو قمر یورش میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا میں نے تمہیں صرف اس لئے آگے بڑھایا ہے کہ تم ایک سچے انسان ہو" تم میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہے - اگر تم میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو میں تمہاری ہرگز ہمت افزائی نہ کرتا قاسمی صاحب اکثر نئے لکھنے والوں کی سرپرستی کرتے ہیں اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہیں - اسی لئے دوسرے دائیں بائیں بازو کے ادیبوں کے دونوں گروپوں میں ایسا باحوصلہ شخص کوئی نہیں ہے راقم ان کے پاس اکثر لوگوں کے کام کرانے کے لئے جاتا رہتا ہے اگر وہ کر سکتے ہوں تو کر دیتے ہیں نہ کر سکتے ہوں تو صاف جواب دے دیتے ہیں خواہ مخواہ پریشان نہیں کرتے جو وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں جو وقت دیتے ہیں پوری ذمہ داری سے اس پر پورا اترتے ہیں یہ ان کی خوبی مجھے بہت پسند ہے وہ ٹرخانے سے کام نہیں لیتے اُن کے سامنے اگر کوئی کسی کی دل آزاری کرے تو فوراً ٹوک دیتے ہیں میں نے ایک دن کہا قاسمی صاحب میں آپ سے اکثر کام کراتا رہتا ہوں کبھی دکھیا تو آپ کہتے ہوں گے یہ پیشہ ور کام کرانے والا کہاں سے چمٹ گیا یہ قاسمی صاحب کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے کہا قمر یورش تم کون سے میرے پاس ذاتی کام لے کر آتے ہو تم سماجی کارکن ہو تم دن رات لوگوں کے درد بانٹتے ہو" یہ تمہارا ہی دل گردہ ہے تمہاری وجہ سے نیکیوں میں میرا حصہ بھی پڑ جاتا ہے" انہیں پیسہ جوڑنا نہیں لٹانا آتا ہے جھوٹ نہیں سچ بولنا آتا ہے اکثر بڑے بڑے مسائل اُن کی زندگی میں آئے جو انہوں نے بڑی آسانی سے حل کر لئے یہی وجہ ہے ان کی عظمت کا سکہ ہمیشہ کے لئے میرے دل پر بیٹھ گیا بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں اور وہی لوگ عظیم کہلاتے ہیں قاسمی صاحب کے پاس پیسے نہ بھی ہوں پھر بھی ان کے

ہونٹوں پر مسکراہٹ موجود رہتی ہے آنکھوں میں غور و فکر کی چمک زیادہ تیز ہو جاتی ہے کبھی وہ گم سم نظر آتے ہیں" اور کبھی قہقہے لگاتے ہوتے ہیں ان کی اس شانِ قلندرانہ کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ روپیہ پیسہ نہ ہونے کے باوجود ان کی وضع داری میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا اکثر فنکار جب اپنے مسائل اور آپس کے جھگڑے لے کر ان کے پاس آتے ہیں تو وہ گتھی دل جمعی سے سلجھا دیتے ہیں۔ ابھرتے ہوئے نئے فنکاروں کا مستقبل سنوارتے ہیں فن کی تخلیق اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی ان کی زندگی کا مشن بن چکا ہے۔ ہر کسی کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھاتے ہیں راقم جب کبھی فنون کے دفتر چلا جاتا تو اکثر محفل جمی ہوتی اور ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ ہوتی اور ایک دفعہ کا ذکر ہے موسم گرما کا سورج آسمان سے آگ برسا رہا تھا میں پسینے میں شرابور سیلٹی رنگ کے ملیشیا کے سوٹ میں ملبوس تھا جو میرے پسینے سے چھاتی کے پاس سے سیاہ ہو چکا تھا قاسمی صاحب نے میرا سیاہ سینہ دیکھا تو از راہ مذاق سے بولے قمر قریشی کیا بات ہے تمہاری ساری چھاتی سیاہ ہو رہی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا جی ہاں اندر گناہوں کی سیاہی ہے جو باہر آ رہی ہے اس جواب سے پاس بیٹھے ہوئے تمام لوگ مسکرانے لگے قاسمی صاحب کہنے لگے قمر قریشی تمہارا دل تو بڑا معصوم اور بلور کی طرح صاف شفاف ہے یہ گناہوں کی سیاہی کہاں سے آگئی ایک روز میں فنون کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب تشریف لائے اور آتے ہی قاسمی صاحب سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی کہنے لگے ندیم شراب پلاؤ قاسمی صاحب نے مسکرا کر کہا میاں شراب تو نہیں چائے مل سکتی ہے میری رگ ظرافت پھڑکی میں نے کہا مولانا آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں یہ شراب خانہ نہیں فنون کا دفتر ہے یہاں شراب ۔۔ نہیں

اگر آپ نے شراب پینی ہے تو شاہراہ قائداعظم کے کسی انگریزی کا ہوٹل کا رخ کریں، پھر اچانک حفیظ جالندھری کی نظر خالد احمد پر پڑی تو کہنے لگے مجھے یہ نوجوان بہت پسند ہے میں نے حفیظ صاحب کو چھیڑتے ہوئے کہا مولانا میں نے تو ایسا نالائق شاعر زندگی بھر نہیں دیکھا کیونکہ نالائقوں کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں کوئی اوّل درجے کا نالائق ہوتا ہے کوئی دوم درجے کا اور کئی تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ نالائقی میں پی ایچ ڈی کر چکے ہوتے ہیں اور خالد احمد نے بھی ایم اے اور بدتمیزی میں ڈبل ایم اے کیا ہوا ہے یہ سن کر تمام دوست خوب ہنسنے لگے حفیظ جالندھری کہنے لگے ایسا خوش خلق ملنسار نوجوان بدتمیز نہیں ہو سکتا میں نہیں مانتا۔ میں نے جواب دیا جی ہاں آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے حفیظ جالندھری نے مجھ سے پوچھا آپ کے پاس اس کے بدتمیز ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ میں نے جواب دیا اس سے بڑھ کر اور کیا بدتمیزی ہو سکتی ہے کہ اس نے آپ کی معرکہ آرا نظم چھونٹی نامہ لکھی کے جواب میں ایک طویل نظم "مچھر نامہ" لکھ ماری ہے۔ اس سے بڑی بدتمیزی اور کیا ہو سکتی ہے یہ سن کر حفیظ صاحب بہت خوش ہوئے انارکلی میں کبھی کبھی ہفتوں فنوں کی محفل سے غائب ہوتا تو قاسمی صاحب پیغام بھیج کر مجھے بلا لیتے میں حاضر ہوتا تو کہتے قمر یورش آجایا کرو تمہارے آنے سے ..... میں فوراً بات کاٹ کر کہتا کہ وقت ضائع ہوتا ہے نہیں بھئی روح کو تازگی ملتی ہے وہ جواب دیتے یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے حالانکہ میرے ان کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے کبھی کبھی میں بات کرتے ہوئے غصے میں پٹڑی سے اتر جاتا تو وہ مجھے بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہتے دیکھو قمر یورش یہ تمہارا ہی کام ہے کہ تھانوں میں

پولیس کا تشدد بھی برداشت کرتے ہو اور سچائی بھی لکھتے ہو مگر میرے بھائی! میں اب بڈھا ہو رہا ہوں مجھ میں جیل جانے کا حوصلہ اور ہمت باقی نہیں ہے ایک روز جب مجھے شرارت سوجھی میں دفتر فنون میں جاکر اور سلام کر کے ایک کرسی پر خاموش بیٹھ گیا! قاسمی صاحب نے پوچھا قمر یورش خیریت تو ہے آج تم بہت اداس نظر آتے ہو۔ وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ میری طرف متوجہ ہوئے میں نے جواب دیا "جی ہاں" بس ذرا طبیعت ٹھیک نہیں قاسمی صاحب نے پوچھا تمہاری طبیعت ناساز کیوں ہے؟ میں نے کہا بات بتانے کی نہیں ہے۔ کہنے لگے۔ بھئی ہمیں بھی تو بتاؤ ہم تمہارے دوست ہیں۔ انسان اپنے دوستوں کو تکلیف نہیں بتائے گا تو کیا دشمنوں کو بتائے گا مصیبت میں رشتہ دار تو بعد میں کام آتے ہیں پہلے دوست ہی پہنچتے ہیں میں نے کہا جی ہاں آپ نے ٹھیک فرمایا ہے۔

پھر بتاؤ کیا بات ہے! میں نے کہا کہ میں ابھی ابھی ایک نجومی کو ہاتھ دکھا کر آرہا ہوں! "ارے" قاسمی صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "خیریت تو تھی" میں نے جواب دیا "بالکل خیریت تھی قاسمی صاحب بولے یقین نہیں آتا کہ تم نجومی کے پاس گئے ہو۔ یہ تو بیسویں صدی کا معجزہ ہے لوگ میری طرف بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے تم کیوں گئے تھے نجومی کے پاس۔ اس نے تمہیں کیا بتایا۔ میں نے تھوڑا سا سسپنس قائم کرتے ہوئے کہا جناب میں نجومی کے پاس ہاتھ دکھانے کے لئے گیا تھا۔ میرے تمام دوست ایک مدت سے میرا مذاق اڑا رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ قاسمی صاحب تمہارے بہت دوست بنتے ہیں لیکن آج تک انہوں نے تمہاری ایک بھی کہانی اپنے رسالہ میں شائع نہیں کی...

کی ۔ میں نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا کہ میری کہانیاں غیر معیاری ہوتی ہیں ان میں خوبصورتی تو نام کو بھی نہیں ہوتی، اس لئے وہ فنون میں چھپنے کے لائق نہیں ہوتیں میرے دوستوں نے کہا تمہاری کہانیاں تو بڑی خوبصورت اور معیاری ہوتی ہیں ان میں کیا کیڑے پڑے ہوتے ہیں ۔ یہ بات نہیں بلکہ دراصل بات یہ ہے کہ قاسمی صاحب صرف ان لوگوں کو فنون میں جگہ دیتے ہیں جو منہ پر تو قاسمی صاحب کی تعریف کرتے ہیں اور پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں میں ان دوستوں کی بک بک سے تنگ آ کر آج ایک نجومی کو ہاتھ دکھانے گیا تھا ہاتھ دکھا کر پوچھا بھائی سچ سچ بتاؤ میری زندگی میں کبھی میری کہانی بھی رسالہ فنون میں چھپے گی یا نہیں؟ اس نجومی نے پہلے تو میرا زائچہ بنایا پھر خوب غور کرکے اور حساب لگا کر بتایا نہیں بھئی تمہاری زندگی میں تمہاری کوئی کہانی فنون میں نہیں چھپے گی ۔ البتہ تمہاری وفات کے بعد صرف ایک کہانی ضرور چھپے گی، اور ساتھ ہی نمایاں حاشیے کے ساتھ تعزیتی اداریہ لکھا ہوگا، جس میں تمہاری خاموش عوامی ادبی خدمات کا اعتراف کرکے تمہیں عظیم افسانہ نگار اور اپنے وقت کا منصور بھی لکھا جائے گا میرا خیال ہے اس نجومی نے محض میرا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا ہے کہ میرے مرنے کے بعد ایک کہانی فنون میں چھپے گی، حالانکہ مجھے اس کی بھی کوئی امید نہیں میری یہ باتیں سن کر تمام لوگ ہنسنے لگے قاسمی صاحب ہاتھ جوڑ کر بولے قریشی تم نے کونسی کہانی ہمیں بھیجی ہے جو ہم نے شائع نہیں کی تم اپنی کہانی بھیجو ہم اسے ضرور شائع کریں گے ۔ میں نے نرمی سے جواب دیا آپ کی خدمت میں جلد ایک ٹوٹی پھوٹی کہانی پیش کردوں گا آپ مرمت کرکے اسے فنون میں شائع کردیں مجھے میرے دوستوں

کے عذاب سے بچائیں، اگر وہ کہانی بھی ناقابل اشاعت ہو تو آپ خود ایک کہانی لکھ کر میرے نام سے فنون میں شائع کر دیں میں آپ کا تازیست احسان مند رہونگا فنون کے دفتر میں خالد احمد پہلے سے ہی موجود ہوتا قاسمی صاحب نے خالد احمد کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کی ہے اس لئے انہیں خالد احمد سے بڑی محبت ہے اور خالد احمد بھی جو زبان کا غلیظ سہی لیکن دل کا بہت اچھا ہے، قاسمی صاحب کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور نئے لکھنے والوں کی دل آزاری کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تمام لوگ صرف قاسمی صاحب کی وجہ سے اس کی خرمستیوں کو برداشت کرتے ہیں خالد احمد کبھی جھگڑ بازی سے باز ہی نہیں آتا اور ہر ایک سے الجھ جاتا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اپنے آپ کو عقل کل سمجھتا ہے اس لئے سب دوست احباب تنگ آئے ہوئے تھے، وہ روزانہ فنون کے دفتر میں آتا اور وہاں پر موجود نوجوانوں کو اپنے تیر ستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیتا میرے وہاں پہنچنے پر خالد احمد سے تنگ آئے ہوئے لوگ میرے ساتھ مل کر اس کے خلاف محاذ بنا لیتے اور اس کا گھیراؤ کر کے اس کی خوب درگت بناتے وہ بھی چکنی مٹی کا گھڑا ہے ہمارے تابڑ توڑ حملوں کا اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا وہ دراصل پیدائشی ڈھیٹ ہے ہر وقت ہنستا رہتا۔ میں نے ایک دن تنگ آ کر قاسمی صاحب سے کہا جناب قاسمی صاحب آپ کی شخصیت سے کتنے لوگ فیض یاب ہوئے ہیں آپ پارس ہیں لوگ آپ کے ساتھ لگ کر سونا بن گئے ہیں، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خالد احمد آپ کے پاس بیٹھ کر آدمی سے پتھر کیسے بن گیا ہے اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا، قاسمی صاحب افسردہ ہو کر کہنے لگے بھائی میں کیا کروں یہ میرا عزیز ہے۔ میں اسے

بہترا سمجھاتا ہوں مگر یہ میری کوئی بات ہی نہیں مانتا، سب لوگوں کے سامنے میری شاعری کا بھی مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے ندیم بھائی آپ کی فلاں نظم میں فلاں مصرعہ بالکل غلط ہے معلوم ہوتا ہے مصرعہ پٹڑی سے اتر گیا ہے، میں نے ایک روز ناراض ہو کر کہا صاحب آپ ایسا کریں کہ خالد صاحب کا فنون میں داخلہ بند کر دیں تاکہ لوگ آپ کے بارے میں کوئی غلط تاثر نہ لے سکیں۔ کیونکہ اکثر یہی کہتے ہیں کہ قاسمی صاحب نے خالد احمد کو فنون میں آنے والے لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو ایک پینٹر سے ایک چھوٹا سا بورڈ لکھوا کر سامنے والے دروازے پر لگا دیں کہ فنون میں خالد احمد کا داخلہ بند ہے قاسمی بولے ہم نے ایک ایسا بورڈ پہلے لکھ کر لگایا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا کہ فنون کے دفتر میں خالد احمد کا داخلہ بند ہے۔ میں نے پوچھا اب وہ بورڈ کہاں گیا، قاسمی صاحب کہنے لگے اس بورڈ نے جانا کہاں تھا۔ یہی خالد احمد اسے چوری کر کے لے گیا ہے" عام لوگ قاسمی صاحب کا نام سن کر سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کے امیر ترین آدمی ہیں میں بھی ان کو امیر آدمی سمجھتا ہوں کیونکہ وہ بڑے دریا دل ہیں اور اس لحاظ سے دنیا کے کسی بھی دولت مند شخص سے زیادہ کشادہ دست اور حاتم سے زیادہ سخی اور رستم سے زیادہ باظرف ہیں غریب دوستوں کی مالی مدد کرتے ہیں مجھے جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی تو چٹ لکھ کر دے دیتا وہ لفافے میں حسب ضرورت پیسے ڈال کر لفافہ مجھے پکڑا دیتے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو پتہ بھی نہ چلتا تھا ایک روز مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی "امروز" میں میرا بل بنا ہوا تھا لیکن ادائیگی نہ ہوئی تھی فنون میں جا کر قاسمی صاحب سے کہا مجھے پیسوں کی ضرورت ہے انہوں نے کہا جتنے پیسوں کی ضرورت ہے مجھ سے لے لو" میں نے کہا جناب

آپ کا بہت بہت شکریہ مجھے آپ سے پیسے نہیں لینے امروز میں میرا بل بنا ہوا ہے آپ ظہیر بابر صاحب کے نام چٹ لکھ دیں تو میرا کام ہو جائے گا انہوں نے کہا چٹ لکھنے کی کیا ضرورت ہے میں خود تمہارے ساتھ چلتا ہوں وہ خود انارکلی سے میرے ساتھ پیدل چل کر امروز اخبار کے دفتر میں آئے اُسی وقت میرا بل پاس کرا کے مجھے پیسے دلا دیئے امروز اخبار کے دفتر میں دھوم مچ گئی کہ قاسمی صاحب قمر نورش کو بل دلانے کے لئے آئے ہیں رقم دلا کر وہ مجھے ظہیر بابر کے کمرے میں لے گئے اور کہا ظہیر! قمر نورش سے ملو یہ میرے بہترین دوست ہیں، ظہیر بابر نے مُسکرا کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا جی ہاں میں انہیں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں ایک روز میں دفتر فنون میں گیا تو قاسمی صاحب میری کتاب کی تعریف کرنے لگے قمر نورش تم نے کمال کر دیا ہے اُدھر میں شرم کے مارے بے حال تھا، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قاسمی صاحب میری تعریف نہیں بلکہ بھری محفل میں میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا اور اس انداز سے بات کرتا تو میں یقیناً اس سے لڑ پڑتا لیکن قاسمی صاحب کا معاملہ ہی اور تھا نرمی سے پوچھا جناب آپ کو میری کونسی کتاب پسند آگئی ہے تو بولے کہ میں نے شاہی قلعہ سے جیل تک پڑھی ہے کتاب پڑھتے وقت مجھے اپنا شاہی قلعہ کی اسیری کا زمانہ یاد آگیا تھا۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آنکھوں کے سامنے کوئی فلم چل رہی ہے تمہاری یہ شاہی قلعہ کی اسیری کی کہانی بڑی پُر درد دلچسپ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ آج سے پندرہ سال قبل جب میں نے یہ کتاب اُن کی خدمت میں پیش کی تھی تو بڑے عجز و انکساری سے کہا تھا قاسمی صاحب آپ کو لوگ ...... ہزاروں کتابیں

بطور تحفہ پیش کرتے ہیں مگر اس ناچیز کی یہ معمولی کتاب بھی قبول فرمائیں اور فرصت ملے تو اسے پڑھ کر اپنی قیمتی رائے سے نوازیں۔ سو انہوں نے آج پندرہ سال کے بعد میری وہ کتاب پڑھی اور قاسمی صاحب تیار بیٹھے تھے کہ بلا کم و کاست اپنی رائے بیان کر دی رات کو میں نے پڑھنے کے لئے کچھ کتابیں تلاش کیں تو تمہاری کتاب بھی میرے ہاتھ آ گئی واہ واہ پڑھ کر دل کو سرور آ گیا۔ میں نے جب لوہا گرم دیکھا تو ہتھوڑے سے چوٹ مارتے ہوئے کہا قاسمی صاحب اگر میں نے غلطی سے ایک اچھی کتاب لکھ ہی لی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ مجھے زبانی تعریف پر ہی نہ ٹرخائیں بلکہ دو چار حروف تبرکاً لکھ دیں تاکہ جو سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئیں۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے قاسمی صاحب نے فوراً قلم اٹھایا اور "شاہی قلعہ سے جیل تک اپنی قیمتی رائے لکھ کر میرے حوالے کر دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روز مشہور انقلاب پسند دادا امیر حیدر خاں راولپنڈی سے لاہور تشریف لائے میرے ساتھ بات چیت کے دوران انہوں نے قاسمی صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا میں انہیں فنون کے دفتر لے آیا قاسمی اور دادا امیر حیدر خاں دونوں جیل میں اکٹھے رہ چکے ہیں اب مل کر دونوں بڑے خوش ہوئے دادا امیر حیدر خاں نے از راہِ مذاق قاسمی صاحب سے کہا ندیم قمر یورش کے خلاف امروز میں ایک کالم لکھو اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کرو کہ وہ قمر یورش پر پیدل چلنے کا ٹیکس لگائے کیونکہ اس نے پیدل چل چل کر لاہور کی تمام سڑکیں تباہ و برباد کر دی ہیں قاسمی صاحب کہنے لگے دادا جی اس بات کو میں بہت پہلے سے ہی سوچ رہا تھا واقعی قمر یورش کے پیدل چلنے پر ٹیکس لگنا چاہیئے۔ خالد احمد نے کہا دادا جی آپ نے قمر یورش کے پیدل چلنے کا لطیفہ نہیں سنا

دادا امیر حیدر خاں نے کہا نہیں خالد احمد کہنے لگا ایک روز قمر یورش سے تنگ آکر تمام لاہور کی سڑکیں خدا کے حضور سجدہ میں گر پڑیں اور گڑگڑا کر التجا کی "اے باری تعالیٰ ہمیں اس ظالم قمر یورش سے بچا یہ ہمیں دن رات بڑی بے رحمی سے کچلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو بلا کر حکم دیا کہ وہ لاہور کی سڑکوں کو ظالم قمر یورش سے کچھ عرصہ کے لئے نجات دلائے پھر کیا تھا فرشتے نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قمر یورش کی ٹانگ ایک لکڑی کی سیڑھی سے زمین پر گرا کر توڑ دی جس کی وجہ سے یہ ایک سال کے قریب بستر پر لیٹا آرام کرتا رہا۔ اور سڑکوں کی اس سے جان چھوٹ گئی خالد احمد یہ لطیفہ سنا کر خوب ہنسا دادا امیر حیدر خاں نے کہا ندیم اپنے کالم میں یہ لطیفہ بھی ضرور لکھنا ۔ یہ بڑا خوبصورت لطیفہ ہے

ایک روز میں قاسمی صاحب کے ہاں گیا تو وہاں پر عطا الحق قاسمی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ قاسمی صاحب کہنے لگے قمر یورش عطا الحق قاسمی نے مجھ پر ایک مضمون لکھا ہے۔ میں نے مصنوعی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "واقعی" "جی ہاں"۔ قاسمی صاحب بولے میں نے کہا یہ تو قرب قیامت کی نشانی ہے۔ قاسمی صاحب کہنے لگے تمہیں پتہ ہے قمر یورش انہوں نے مجھ پر کیا لکھا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو قاسمی صاحب نے بتایا ان حضرت نے لکھا ہے کہ میں اور احمد ندیم قاسمی ایک ہی خاندان کے آخری چشم و چراغ ہیں"۔ قاسمی صاحب نے آخری پر زور دے کر کہا تو میری سمجھ میں بات آئی میں نے فوراً مزید نمک مرچ لگاتے ہوئے کہا تو آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ انہوں نے آپ کو آخری چشم و چراغ ہی لکھا ہے اگر یہ آپ کو آخری لالٹین لکھ دیتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا پاس بیٹھے ہوئے عطا الحق قاسمی

شرمسار ہو رہے تھے فنون میں ایسی چٹکلے بازی اور چھیڑ چھاڑ ایک معمول کا درجہ رکھتی ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں فنون کے دفتر گیا تو محفل شباب پر تھی ۔ اور خوب لطیفہ بازی ہو رہی تھی قاسمی صاحب نے مجھے دور سے آتے ہوئے دیکھا تو خالد احمد سے کہا قمر یورش آرہا ہے، ذرا کانٹا بدل دے مگر تو بہ کیجیے خالد احمد باتوں میں پھسلا ہوا کہاں قابو میں آتا ہے، قاسمی صاحب اُسے بار بار کانٹا بدلنے کو کہتے، مگر وہ سُنی ان سُنی کر رہا تھا جب میں سلام کر کے کرسی پر بیٹھا تو خالد احمد اچانک بڑے ادب و احترام سے اٹھا اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا جھک کر فرشی سلام کیا اور شرارت سے کہنے لگا "با ادب ! باملاحظہ ہوشیار ! ظلِ الٰہی قمر یورش کی سواری آرہی ہے میں تو یہ سُن کر بہت پریشان ہوا لیکن لوگ خوب ہنسے اس پر میں نے قاسمی صاحب کو داد دیتے ہوئے کہا واہ جی واہ قاسمی صاحب آپ کا بھی جواب نہیں ایسا درباری مسخرہ تو بڑے بڑے مہاراجوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا یہ سن کر خالد احمد بہت شرمندہ ہوا خالد احمد میری اکثر دفتر میں نوک جھونک ہوتی رہتی ہے لوگ یہ طنزیہ مزاحیہ باتیں سُن کر بہت محظوظ اور محفل کشت زعفران بن جاتی اکثر بڑی علمی ادبی سیاسی سائنسی باتیں ہوتی تھیں ۔ کہ محفل سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا یہ باتیں جواہر ریزوں سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی تھیں ۔ قاسمی صاحب اپنی غربت کو کبھی نہیں بھولتے اچھے موڈ میں ہوتے تو اپنی غربت کا کوئی نہ کوئی واقعہ مزے لے لے کر سُناتے ۔ ایک دن انہوں نے بتایا کہ سکول میں ساتھ والی سیٹ سے لڑکے کی پنسل بستے سے گر گئی اور میں نے چپکے سے اُٹھا کر چھپالی اور اُسے

گھر لے آیا گھر آ کر والدہ سے کہا یہ پنسل مجھے زمین پر گری ہوئی ملی ہے والدہ بہت خوش ہوئیں اس نے لکڑی کی پنسل میں سوراخ کر کے رنگین ریشمی دھاگے کا ایک پھندنا سا بنا لیا اب میں اس پنسل سے کام بھی نہ کرتا تھا صرف اُس خوبصورت پنسل کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور اُسے اپنے سکول بھی نہ لے کر جاتا تھا ڈرتا تھا کہ اگر میں اپنی پنسل کو سکول لے کر گیا تو وہ لڑکا پہچان کر مجھ سے دوبارہ چھین لے گا تین چار مہینے تو میں نے اسے بڑی احتیاط سے گھر میں چھپائے رکھا لیکن ایک روز میں غلطی سے اُسے سکول لے گیا اس لڑکے نے اپنی پنسل دیکھ کر شور مچا دیا کہ یہ میری پنسل ہے مقدمہ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا انہوں نے مجھے بلا کر پوچھا سچ سچ بتاؤ پنسل کس کی ہے میں نے کہا میری ہے اس لڑکے نے کہا میری ہے ماسٹر صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ تم نے کہاں سے لی ہے میں نے جھوٹ بولا کہ فلاں ہندو دوکاندار سے خریدی ہے وہ دوکاندار گاؤں کا ہی رہنے والا تھا ماسٹر نے دو لڑکے اُس دوکاندار کو بلانے کے لئے بھیجے جونہی لڑکے دوکاندار کو بلانے کے لئے گئے میں نے دل میں خدا سے دُعا مانگی خداوندا وہ دوکاندار شہر میں سودا خریدنے گیا ہو، اور آج اس کی دوکان بند ہو خدا نے میری دُعا قبول کر لی وہ دوکاندار واقعی شہر سودا لینے گیا ہوا تھا اور دوکان بند تھی لڑکے ناکام واپس آ گئے ماسٹر صاحب نے ترکیب نمبر دو استعمال کی اور دوکاندار کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا پنسل میری انگلیوں میں پھنسا کر یوں بے دردی سے مروڑ دیا جیسے دھوبی گیلے کپڑے کو نچوڑتا ہے میری چیخیں نکل کر ساتویں آسمان تک پہنچ گئیں ماسٹر صاحب نے پوچھا احمد سچ سچ بتاؤ یہ پنسل کس کی ہے میں نے زور سے چیخ

کر جواب دیا۔ ماسٹر جی شریف کی ہے میری نہیں مگر پھر کہا۔ میرے اکثر کتابیں کاپیاں اور پنسلیں خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوتے تھے، والدہ محترمہ کیکر کے پیڑ سے گوند اتار کر اور توے کی سیاہی لے کر ہمارے لکھنے کے لئے خود ہی روشنائی تیار کرتی تھیں ایک روز حلقہ احباب ادب شاہدرہ کے زیر اہتمام احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ایک شام منائی گئی یہ حلقہ احباب ادب محنت کش ساتھیوں کا قائم کردہ ہے اس رات۔ اجلاس سے فارغ ہو کر آدھی رات کے وقت قاسمی صاحب اپنے ساتھیوں سمیت واپس گھر کو روانہ ہوئے۔ سردی اپنے پورے جوبن پر تھی سارا شہر خاموش تھا دور کھیتوں میں گیدڑوں کی آواز آ رہی تھی دن کے ہنگامے رات کی گود میں سمٹ چکے تھے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی رات ہیبت ناک تھی، ابر سیاہ کے ٹکڑے ہوا کے دوش پر تیزی سے اڑ رہے تھے۔ وقت کی بوجھل گھڑیاں زخمی سانپ کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہی تھیں ستارے سردی میں کانپ کانپ کر فضائے تاریک میں غائب ہو چکے تھے اور زرد رنگ کا سہما ہوا چاند بادل کے ایک ٹکڑے کی پشت پر چھپنے کی کوشش کر رہا تھا سردی کے مارے ہمارے ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے میں نے رات کے سیاہ کھردرے سینے پر نظریں گاڑتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ نہ جانے کب ستم کی سیاہ خونی رات ڈھلے گی۔ اور نور صبح کب ہوگی قاسمی صاحب کہنے لگے صبح ضرور طلوع ہوگی۔ مشرق سے نور کے چشمے پھوٹ بہیں گے اور پاکستان کے محنت کشوں کی زندگی ضرور بدلے گی ایک نیا انسان پیدا ہوگا۔ ایک نئی دنیا آباد ہوگی۔ خوشیاں عوام کا استقبال کریں گی اور دکھی انسانیت کا مستقبل جگمگا اٹھے گا۔

# آغا شورش کاشمیری

جب کبھی بیتے لمحے یاد آتے ہیں ...... تو میرا دل تڑپ اٹھتا ہے اور طائرِ خیالی بے اختیار ماضی کے سبزہ زاروں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ دماغ میں ان گنت خیالات گھومنے لگتے ہیں جیسے پانی میں بھنور رقص کر رہا ہو۔ تصورات کی گہرائیوں میں یادیں اس طرح اُبھرتی ہیں جیسے دریا کی ہلکی ہلکی لہروں پر کشتی آہستہ آہستہ سے چلی آ رہی ہو اور لحہ بہ لمحہ ساحل کے قریب پہنچ رہی ہو۔ گزرے ہوئے دن نظروں کے سامنے حقیقت کا لباس پہن کر گھومنے لگتے ہیں، بعض لوگوں کی یادیں تو دل پر غیر شعوری طور پر نقش ہو جاتی ہیں۔

غالباً ۱۹۴۶ء کے ابتدائی ایام تھے۔ برما اور آسام کے گھنے جنگلوں میں دوسری عالمگیر جنگ کے سُرخ شعلے مدھم پڑ چکے تھے۔ اور جنگ کے سیاہ دھویں کے کثیف بادل ابھی تک اُمڈ رہے تھے ہیروشیما اور ناگاساکی کی خوفناک تباہی کی یادیں ذہنوں میں ہنوز

تازہ تھیں ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ برطانوی شہنشاہت کے دماغ میں سمایا فتح کا نشہ جوشیلے نوجوانوں کے نعروں سے ہرن ہو رہا تھا۔ بمبئی میں سمندری بیڑے کے جہازیوں کی بغاوت نے انگریزوں کے لاڈلوں کے سامراجی عزائم کے بخئیے ادھیڑ دیئے تھے اور ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ مسلح انقلاب اب مٹھی بھر دہشت پسندوں کا خواب نہیں بلکہ ایک حقیقت بن گیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ ایک نیا ورق پلٹ رہی تھی۔ جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی تمام بڑے بڑے سیاسی نظر بند رہا کر دیئے گئے تھے ان سیاسی رہنماؤں میں احراری رہنما آغا شورش کاشمیری بھی تھے۔ جو سالہا سال کی قید و بند سے آزاد ہوئے تھے۔ اُن دنوں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی اور ہر روز جلسے ہوتے جلوس نکلتے اور مظاہرے ہوتے تھے پنجاب اور خاص طور پر امرتسر حریت پسندوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ امرتسر میں بچے بچے کی زبان پر یہ نعرے تھے۔

لال قلعہ سے آئی آواز
سہگل ڈھلوں شاہنواز
لال قلعہ کو توڑ دو
آزاد ہند فوج کو چھوڑ دو
ہندو مسلم سکھ عیسائی
سب کی دشمن نوکر شاہی

میں ان دنوں بہت چھوٹا سا تھا مگر مجھے سیاست کی چاٹ لگ چکی تھی اس وقت

میرے دل میں ملک کی آزاد کرانے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر جیل جانے کی بڑی آرزو تھی۔ فرنگی سامراج کی غلامی سے نفرت مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی میرے والد بزرگوار مولانا ابوالکلام آزاد کے پرستار تھے اور انگریز راج سے نفرت کرتے تھے۔ اس وقت سارے پنجاب میں احرار اسلام جمیعت علمائے اسلام کانگرس خاکسار تحریک کا بہت چرچا تھا مسلم لیگ ابھی نوابزادوں کے ڈرائینگ رومز میں بند تھی اور ان کے لیڈروں کو انگریز کا ٹوڈی بچہ کہا جاتا تھا کیونکہ اس وقت عوام کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ ان دنوں آغا شورش کاشمیری کی خطابت اور بے مثال قربانیوں کی بہت دھوم تھی میں اُن کی شخصیت کا اَن دیکھا عاشق تھا وہ میرے ذہن میں ایک بہت خوبصورت گورے چٹے نوجوانوں کے روپ میں جلوہ گر تھے۔ جیسے رومانی فلموں کے اکثر ہیرو ہوتے ہیں۔ آغا صاحب لاہور میں رہتے تھے اور راقم امرتسر میں۔ ایک روز یہ خبر سُنی کہ آغا صاحب تقریر کرنے کے لئے امرتسر تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی آمد کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔ آخر وہ دن بھی آگیا رات کے وقت بعد از نماز عشاء ہاتھی گیٹ میں ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا میں اپنے ساتھیوں سمیت جلسہ میں تقریر سُننے گیا۔ دیکھا تو جلسہ گاہ میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ احرار کے سُرخ پرچموں سے اسٹیج خوب سجا ہوا اور بجلی کے قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا رسمی کارروائی یعنی ایک آدھ نظم دو تین مقامی مقرروں کی تقریروں کے بعد آغا صاحب کا نام پکارا گیا۔ تمام جلسہ گاہ پُرشور تالیوں سے گونج اٹھی اتنے میں ایک لمبا تڑنگا سانولے رنگ کا نوجوان ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں لڑکھڑاتا ہوا دو آدمیوں کے سہارے اسٹیج

پر نمودار ہوا یہ فخرِ ملت آغا شورش کاشمیری تھے جو دراصل جیل سے سخت بیماری کی حالت میں رہا ہو کر آئے تھے۔ مجھے اس بات کا یقین نہ آرہا تھا کہ یہی آغا شورش کاشمیری ہیں۔ جمالیاتی حس کو بہت ٹھیس لگی۔ میں نے اپنے تصور میں آغا صاحب کا جو حسین مجسمہ تیار کیا ہوا تھا۔ وہ پاش پاش ہو گیا۔ جیسے کسی چالاک مداری نے عوام کو دھوکہ دینے کے لئے آغا شورش کاشمیری کو پیش کرنے کی بجائے قبرستان سے کسی مُردے کا ڈھانچہ لا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہو۔ آغا صاحب کے جسم کی ایک ایک ہڈی ایک ایک نس صاف نظر آرہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم جلسہ گاہ میں نہیں بلکہ کسی میڈیکل کالج کی اناٹومی کی کلاس میں بیٹھے شیشے کی الماری میں بند انسانی ڈھانچہ دیکھ رہے ہوں۔ آغا صاحب کے رخسار خالی رکابی کی طرح نظر آرہے تھے۔ آنکھیں چمکیلی تھیں لیکن اندر کو دھنسی ہوئی۔ آغا صاحب کی ہیبت ناک شکل سے ڈر کر بھاگنے ہی والا تھا کہ اتنے میں ان کی بھاری بھرکم پاٹ دار آواز نے جیسے میرے پاؤں پکڑ لئے آغا صاحب کی آواز سنائی دی۔

"جناب صدر و برادران عالی قدر" یہ رسمی فقرے کہنے کے بعد اُن کی تقریر شروع ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ جنگ میں فوجی بھرتی دینے کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں انہیں گرفتار کر کے شاہی قلعہ لاہور اور ملک کی مختلف جیلوں میں اُن پر بے پناہ ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے گئے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے محبانِ وطن اور شہیدانِ حریت کے سنہری کارنامے بھی بیان کئے جنہوں نے برس ہا برس برطانوی استبداد کا طلسم توڑنے کے لئے جیلوں میں اپنی جوانی کی راتیں تارے گن گن کر گزاری تھیں۔ کئی پھانسی کا جھولا جھول گئے جو پیچھے وہ عمر

قید کی سزا بھگت رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آغا صاحب تقریر نہیں کر رہے بلکہ کوئی آتش فشاں پہاڑ لاوا اُگل رہا ہے۔ میں ان کی شعلہ نوا تقریر کے جادو سے ان کی طرف اس طرح کھنچا چلا گیا کہ جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ آغا صاحب اپنے مخصوص انداز میں پنجاب کے بڑے بڑے نوابوں، جاگیرداروں، رئیسوں اور نوکر شاہی کے پٹھوں کے خلاف بول رہے تھے۔ اور ان کی آواز سے انگریز سامراج کے ایوانوں میں ہلچل مچ رہی تھی۔ اُن کی شعلہ بیانی سے انگریز کے اقتدار کے قلعہ میں شگاف پڑ رہے تھے ان کا ایک ایک جملہ ان کی زبان سے ایسی برق رفتاری سے نکل رہا تھا جیسے کسی برین گن یا اسٹین گن سے آتشیں گولیاں نکلتی ہیں۔ چند سر پھروں نے "انقلاب زندہ باد۔ احرار کا ایٹم بم آغا شورش کاشمیری زندہ باد" کے نعرے لگائے لوگ آغا صاحب کی تقریر کے جادو سے مسحور ہو کر سر دھن رہے تھے۔ آغا صاحب طوفان کی طرح اُٹھے اور بادلوں کی طرح چھا گئے۔ ان کے دلائل سے ہر طرف تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگے۔ کئی لوگ آغا صاحب کی خطابت کے طوفان میں بہہ گئے۔ کئی سُننے والے ششدر رہ گئے۔ کئی ہاتھ اُٹھا کر پُر جوش انداز میں گلہ پھاڑ پھاڑ کر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے لگے اور ساتھ ہی ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کہنے لگے۔ آغا صاحب اسٹیج پر مائیکروفون پر یوں ڈٹ کر کھڑے تھے جیسے کوئی زخمی شیر اپنے حریف کے مدمقابل ڈٹ کر کھڑا ہوتا ہے۔ لوگ اس وقت تصویر حیرت بنے ہوئے تھے اتنے میں کسی شرارتی نے پولیس کے کہنے پر لاؤڈ اسپیکر کے تار کاٹ دیئے مگر آغا صاحب نے پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے گلے سے کام لیا ان کی گرجدار آواز کی بلندی ہی نہیں بلکہ عوام کا تقریر سُننے کا اشتیاق بھی قابلِ داد تھا لوگ

اُسی طرح ہمہ تن گوش تھے۔ کہ سنانے والے کو بھی لُطف آ رہا تھا۔ آپ کی تقریر اتنی پُرجوش اور ولولہ انگیز تھی کہ بار بار "شیرِ پنجاب، آغا شورش کاشمیری زندہ باد" کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ غرضیکہ ایک فاتح تھا جو اپنے غنیم پر چھایا ہوا تھا۔ نو بجے جلسہ شروع ہوا تھا۔ رات اپنی سیاہ کمر کھولتی چلی گئی۔ ستاروں کے کارواں نے اپنا سفر ختم کر لیا تھا اور جب جلسہ ختم ہوا تو صبح آہستہ آہستہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ نورِ سحر پھیلتا جا رہا تھا اور لیلائے شب اپنے سیاہ ریشمی گیسو سمیٹ چکی تھی۔ صبح صادق کی پُرعظمت روشنی نے رات کی گھمبیر سیاہی پر فتح پالی تھی۔ ہم لوگ گھر کی طرف لوٹ رہے تھے اور راستے میں آغا صاحب کی تعریف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ قدرت نے آغا صاحب کے تنِ خاکی میں کتنی آگ بھری ہوئی ہے۔ ہمارا خیال سو فیصد سچ تھا۔ انہوں نے آزادیٔ وطن کے لئے اپنی زبان اور قلم سے ایسا بھرپور کام لیا کہ انگریز سامراج کا طلسم ان کی زندگی میں ہی پاش پاش ہو گیا۔

---

ختم شُد

# شاہی قلعہ سے

# جیل تک



قمر یورش

شاہی قلعہ سے

جیل تک

